تعلیم و تربیت
مئی 2016
سُلطان ٹیپو شہید
تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
PESHAWAR
قصہ ایک سفر کا
صفحہ نمبر 57

بنت سمیرا کی نئی پیش کش

کشمیر مدد سیریز

فیروز سنز کی یوتھ کلب سیریز کے ممبران کے

نئے اور دلچسپ کارنامے
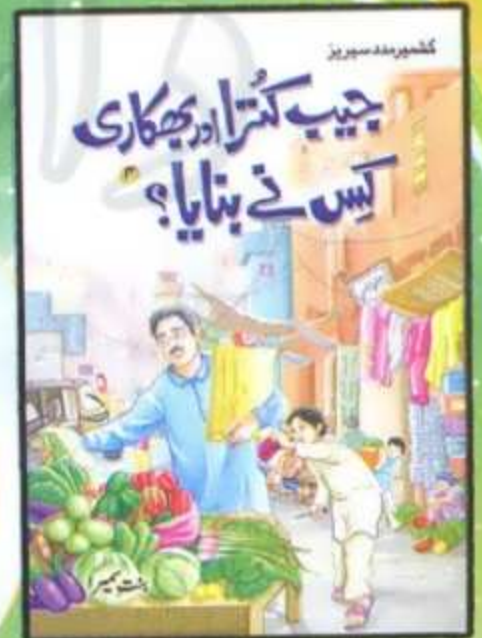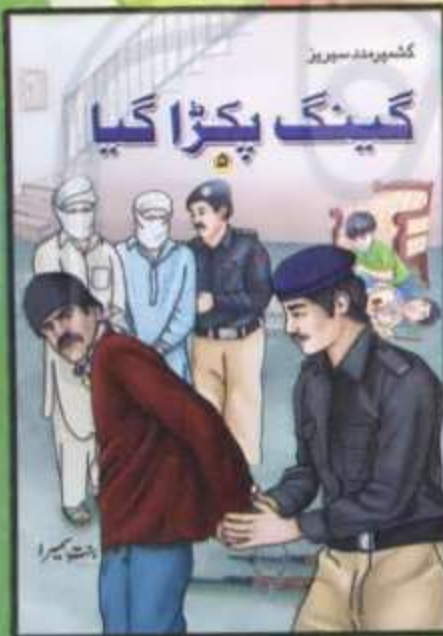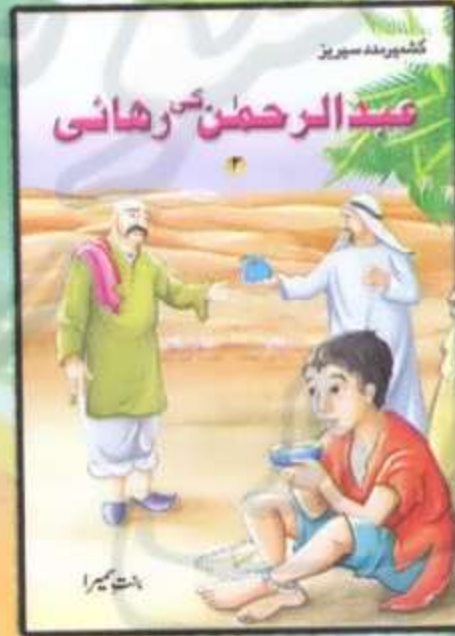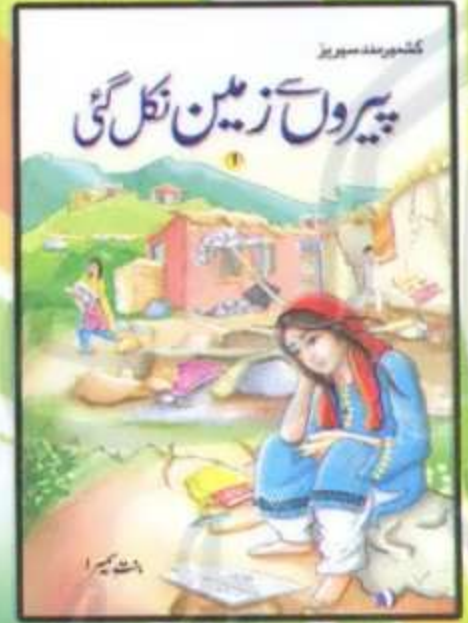
فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

تعلیم و تربیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! پرانے رومی کیلنڈر میں مئی تیسرا مہینہ تھا اور عام خیال یہی ہے کہ یہ مشہور دیوی "مے آیا" کی نسبت سے ہے۔ "مے آیا" سیارہ "مشتری" کی ماں تھی۔ رومی اس مہینے کی پہلی تاریخ کو ایک خاص تہوار مناتے تھے۔ انگلستان میں بھی یکم مئی کو جشن منایا جاتا تھا۔ لوگ مئی پول (Maypole) اور مارس ناچوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خالص موسمی تہوار تھا جسے بعدازاں مذہبی رنگ دے دیا گیا۔ یہ تہوار انیسویں صدی کے آخر تک منایا جاتا رہا لیکن اس صدی کے آخر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس تہوار کی نوعیت بدل دی۔

آج سے ایک سو تیس سال پہلے امریکا کے شہر شکاگو کے مزدوروں نے اپنی لازوال جدوجہد سے ایسی تاریخ رقم کی ہے جو رہتی دنیا تک یاد کی جائے گی۔ 1886ء میں منظم تحریک کا آغاز ہوا۔ مزدور مطالبہ کرتے رہے مگر کوئی مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا جن میں تنخواہوں میں اضافہ، مزدوروں سے غیرانسانی سلوک کی بندش، حقوق کی پامالی کا خاتمہ اور کام کا وقت آٹھ گھنٹے مقرر کرنا جیسے مطالبات شامل تھے۔ حکمرانوں کو یہ مطالبات کسی صورت پسند نہ تھے۔ حکومت نے مزدوروں کے مسائل حل کرنے سے انکار کر دیا۔ شکاگو کے مزدوروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال پر جانے کا فیصلہ کیا، لہٰذا کارخانوں، میدانوں، سڑکوں اور گلیوں میں ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ شکاگو کا صنعتی شہر جام ہو گیا۔ کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند ہو گیا۔ دنیا میں یہ پہلا موقع تھا کہ شکاگو کے مزدوروں نے اپنے لازوال مثالی اتحاد سے علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مکمل ہڑتال کر دی۔

حکمرانوں نے نہتے پُرامن مزدوروں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ پولیس نے نہ صرف مزدوروں پر فائرنگ کی بلکہ بم دھماکہ بھی کروایا جس کے نتیجے میں کافی تعداد میں محنت کش اور پولیس والے مارے گئے۔ مزدوروں پر پولیس کے علاوہ فوج نے بھی فائرنگ کی جس سے شکاگو کے گلی کوچے مزدوروں کے خون سے رنگے گئے۔ شہید مزدوروں کے اس خون سے ایک مزدور نے ایک سفید کپڑے کو رنگ کر محنت کشوں کو عالمی پرچم عطا کیا۔ 5 مئی کو پولیس نے متعدد مقامات پر چھاپے مارے اور سات مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر کے انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا۔ ان رہنماؤں کی قربانی کے نتیجے میں امریکی حکومت نے مزدوروں کے اوقات کار میں دو گھنٹے تخفیف کر دی اور آٹھ گھنٹے مقرر کر دیے۔ چناں چہ یکم مئی شکاگو کے مزدور شہیدوں کی یاد میں ہر سال منایا جانے لگا۔

آہستہ آہستہ اس دن نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی اور 1890ء میں یہ تہوار دنیا بھر میں منایا جا رہا ہے۔ پاکستان میں یہ تہوار سرکاری طور پر سب سے پہلے یکم مئی 1973ء کو منایا گیا اور اب ہر سال باقاعدگی سے منایا جاتا ہے۔ اس روز دفاتر اور کارخانوں میں سرکاری تعطیل ہوتی ہے۔

28 مئی کا دن ہماری ملکی تاریخ کا ایک یادگار اور اہم دن ہے۔ اس دن پاکستان نے چاغی کے مقام پر 5 ایٹمی دھماکے کر کے یہاں اسلامی ایٹمی قوت کی حامل مملکت بننے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کو ہر میدان میں ترقی و استحکام بخشے اور پاکستان دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین!

اس شمارے میں سلطان ٹیپو شہید اور مدر ڈے کے حوالے سے بھی تحریریں حاضر ہیں۔

آئندہ شمارے تک اجازت چاہتے ہیں۔ اپنا اور دوسروں کا بہت سا خیال رکھیے گا۔ فی امان اللہ!

(ایڈیٹر)

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بذریعہ بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 1000 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

حمد باری تعالیٰ

یاالٰہی کرم کر لکھ دے میری تقدیر میں
روضۂ خیر البشر لکھ دے میری تقدیر میں

اے میرے رب شہر مکہ سے مدینے کی طرف
آنا جانا عمر بھر لکھ دے میری تقدیر میں

گزرے دن کے میں شب گزرے مدینے پاک میں
روشنی کا یہ سفر لکھ دے میری تقدیر میں

جتنے بھی ایام اب باقی ہیں میری زیست میں
ہوں مدینے میں بسر لکھ دے میری تقدیر میں

یہ صدائے روز و شب قلب علیم زار کی
پھر مدینے کا سفر لکھ دے میری تقدیر میں

نعت رسول مقبول ﷺ

محبوب کی محفل کو محبوب سجاتے ہیں
آتے ہیں وہی جن کو سرکار بلاتے ہیں

جس کا اس دنیا میں ہے نہیں کوئی والی
اس کو بھی میرے آقا سینے سے لگاتے ہیں

بیمار ذرا جانا دربار محمدؐ میں
وہ جام شفا اب بھی بھر بھر کے پلاتے ہیں

خدایا وہ شاید قسمت کے سکندر ہیں
جو میرے آقاؐ کا میلاد مناتے ہیں

عرصہ ہوا طیبہ کی ان گلیوں سے گزر ہوا
کوشش نہ کرے کوئی واپس بلانے کی

ثمن رؤف، لاہور

معراج کا عظیم واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہونے کے دس سال بعد اور ہجرت مدینہ سے تین سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس سفر معراج کے دو مرحلے ہیں: پہلا مرحلہ مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک جانے کا ہے۔ اس کو "اسراء" کہا جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ مسجدِ اقصیٰ سے آسمانوں پر تشریف لے جانے کا ہے۔ اس کو "معراج" کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں سفرِ معراج کے ان دو مرحلوں کو مختصراً ذکر فرمایا ہے۔ مزید تفصیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آئی ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گئی جس کے ماحول پر ہم نے برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔" (سورۂ بنی اسرائیل، آیت: 1)

اس آیت میں اس معجزانہ سفر کے پہلے مرحلے کو بیان کیا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور رات کے وقت انہیں ایک جانور پر سوار کیا جس کا نام "براق" تھا، وہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آپؐ کو مسجدِ حرام سے بیت المقدس لے گیا۔ اس روحانی سفر کا دوسرا مرحلہ سورۂ نجم کی آیت 13 تا 18 میں بیان کیا ہے جس میں ذکر فرمایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اس معراج کے سفر میں ان کی اصلی صورت میں دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا۔ سدرۃ المنتہیٰ عالم بالا میں ایک بیر کا بہت بڑا درخت ہے۔ اسی کے پاس جنت واقع ہے جس کو "جنت الماویٰ" کہا گیا ہے کیوں کہ "ماویٰ" کے معنی "ٹھکانے" کے ہیں اور وہ جنت مؤمنوں کا ٹھکانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی آیت اٹھارہ میں ذکر فرمایا کہ "سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے بہت کچھ دیکھا۔"

حدیث پاک میں اس سفر کا ذکر یوں ہے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے پاس ایک براق لایا گیا، جو لمبا اور سفید رنگ کا چوپایہ تھا۔ اس کا قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ وہ اپنا قدم وہاں رکھتا تھا جہاں اس کی نظر پڑتی تھی۔ میں اس پر سوار ہوا یہاں تک کہ میں بیت المقدس تک پہنچ گیا۔ میں نے اس براق کو اس حلقہ سے باندھ دیا جس سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام باندھا کرتے تھے۔ پھر میں مسجد میں داخل ہوا اور اس میں دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر ہمیں آسمان کی طرف لے جایا گیا، اور پہلے آسمان میں حضرت آدم علیہ السلام اور دوسرے آسمان میں حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام اور تیسرے آسمان میں حضرت یوسف علیہ السلام اور چوتھے آسمان میں حضرت ادریس علیہ السلام اور پانچویں آسمان میں حضرت ہارون علیہ السلام اور چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور سب نے مرحبا کہا اور ساتویں آسمان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ بیت المعمور سے ٹیک لگائے ہوئے تشریف فرما تھے اور یہ بھی بتایا کہ بیت المعمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جو دوبارہ اس میں لوٹ کر نہیں آتے۔ پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ لے جایا گیا، اچانک دیکھتا ہوں کہ اس کے پتے اتنے بڑے بڑے ہیں جیسے ہاتھی کے کان ہوں اور اس کے پھل اتنے بڑے بڑے ہیں جیسے مٹکے ہوں۔ جب سدرۃ المنتہیٰ کو اللہ کے حکم سے ڈھانکنے والی چیزوں نے ڈھانک لیا تو اس کا حال اتنا بدل گیا کہ اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کے حسن کو بیان کر سکے۔ (مسلم شریف، کتاب الایمان 162)

پیارے بچو! معراج کے اس سفر میں ہی ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہم کلامی کا شرف عطا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اُمت پر پانچ نمازیں فرض فرمائیں۔ یہ تمام سفر ایک ہی رات میں تمام ہوا۔ ☆☆☆

شاہ کار گھڑا

محمد ندیم اختر

کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے کے پُرفضا مقام فورٹ منرو سے چند کوس دُور واقع ایک گاؤں میں ایک کمہار اپنے بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ اپنے گاؤں میں مٹی کے برتن بناتا اور پھر گاؤں سے دُور شہر میں انہیں فروخت کر دیتا تھا۔ ان کا گاؤں کوہ سلیمان کے پہاڑی سلسلے کے خشک اور بنجر پہاڑوں پر واقع تھا۔ یہ پہاڑ پُرانے وقتوں میں بڑے ہرے بھرے ہوا کرتے تھے مگر کچھ سالوں سے ان پہاڑوں پر بارش نہ ہونے کے سبب بنجر پن آگیا تھا اور یہ پہاڑ خشک اور کالے پتھروں کے پہاڑ بن گئے تھے۔ اب بھی ان پہاڑوں پر بارشیں نہیں ہوتی تھیں جب کہ اس کے ارد گرد کے پہاڑی سلسلے پر بارشیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ بارشیں نہ ہونے سے جہاں یہ پہاڑ خشک اور کالے نظر آنے لگے، وہاں دِتو کمہار کا گاؤں بھی خشک اور پتھریلا نظر آتا تھا۔

دِتو کمہار اور اس کے آباء و اجداد صدیوں سے انہی پہاڑوں پر رہتے چلے آرہے تھے۔ اس کو یاد تھا کہ ماضی میں یہ پہاڑ بھی دوسروں پہاڑوں کی طرح سبزے سے بھرے ہوتے تھے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ جب بھی وہ بچپن میں اپنے ابا جان کے ساتھ ٹوبے (پانی والے گڑھے) پر جاتا تھا تو راستے میں خود رو پھولوں کی بہار ہوتی تھی۔ وہ پھولوں اور ان پھولوں پر اُڑتی خوب صورت رنگوں والی تتلیوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا مگر اب بارشیں نہ ہونے کی وجہ سے وہ پھول کیا، خود رو درخت اور لال لال بیروں سے بھری بیریاں بھی ختم ہوگئی تھیں۔

کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ دِتو کمہار نے ایک گھڑا تیار کیا۔ گھڑا جب تیار ہوگیا تو اسے دیکھنے کے بعد اس نے سوچا کہ یہ گھڑا باقی بنائے گئے گھڑوں سے زیادہ خوب صورت ہے۔ پھر اس نے اس گھڑے پر خوب صورت رنگوں سے پھولوں کے نقش و نگار بنائے کہ یہ گھڑا سب گھڑوں سے منفرد لگے۔ ویسے تو اس کے پاس پانی بھرنے کے لیے بہت سے گھڑے تھے لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ یہ گھڑا زیادہ خوب صورت لگے گا تو اس کو مزید خوب صورت بنانے کے لیے اس نے بہت محنت کی، اتنی محنت کہ یہ گھڑا واقعی ایک ''شاہ کار گھڑا'' بن گیا۔ جب یہ گھڑا اس کے بیٹے نواب نے دیکھا تو وہ بہت خوش ہوا اور فوراً بولا:

''ابا جی! آپ یہ گھڑا مجھے دے دیں...... آج کے بعد یہ گھڑا

میرا ہو گیا۔"

"بیٹا! کیسی باتیں کر رہے ہو؟ یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ میں جتنی بھی محنت کرتا ہوں، وہ تمہارے لیے ہی تو کرتا ہوں۔ بس میرا پتر آپ پڑھ لکھ جاؤ اور ایک دن بڑے افسر بن جاؤ، یہ میرا خواب ہے کہ جب میرا پتر نواب پڑھ لکھ کر ایک دن بڑا افسر لگے گا تو میں شہر میں مٹی کے برتنوں کی بڑی سی دُکان بناؤں گا اور آرام سے بیٹھ کر برتن بیچا کروں گا۔ پھر مجھے روز روز ریڑھے پر برتن لاد کر شہر بھی نہیں جانا پڑے گا۔" دِتو نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے خواب اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔ نواب اپنے باپ کی بات سن کر خوش ہو گیا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر سینے سے چمٹ گیا۔

......☆......

دِتو کمہار اس دن بھی صبح سویرے ریڑھے پر پانی بھرنے والے سارے گھڑے رکھ کر گاؤں سے دس میل دُور ٹوبے کی جانب روانہ ہوا تاکہ وہ آج کی ضرورت کا پانی جمع کر کے گھر لے آئے۔ جہاں یہ پانی برتنوں کی مٹی گوندھنے کے کام آتا تھا، وہاں گھر کی ضروریات کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا کہ وہ صبح سویرے پانی بھرنے کے لیے گاؤں سے پندرہ میل دُور جاتا اور واپسی پر برتن لاد کر شہر کا رُخ کرتا اور شام سے کچھ پہلے اس کی گھر کو واپسی ہوتی تھی۔ جب وہ دیکھتا کہ اس کے پاس برتنوں کا ذخیرہ ختم ہونے والا ہے تو پھر وہ ہفتہ بھر کے لیے نئے برتن بنانے میں مشغول ہو جاتا۔ برتن تیار کر کے بھٹی میں پکاتا اور پھر معمول کے مطابق شہر میں بیچ دیتا تھا۔ اس دن جب وہ حسبِ معمول پانی بھرنے کے لیے روانہ ہوا اور پانی والی جگہ پر پہنچ کر اس نے ریڑھے سے گھڑے اُتارے، گھڑے زمین پر رکھ کر ان میں پانی بھرنے لگا تو اسی دوران اس کی ٹھوکر سے وہ گھڑا جو اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا، اپنی جگہ سے کھسک گیا اور ایک پتھر سے جا لگا۔ جلدی سے اس نے گھڑے کو سنبھالا کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے، اس کی پھرتی نے اس گھڑے کو ٹوٹنے سے تو بچا لیا لیکن اس میں ہلکی سی دراڑ پڑ گئی۔ دِتو کمہار "شاہ کار گھڑے" میں پڑنے والی دراڑ دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا کہ یہ اس سے کیا ہو گیا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ یہ گھڑا تو اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا اور اس کی ذرا سی لاپروائی سے شاہ کار گھڑا ناکارہ گھڑا ہو گیا۔ اسی پریشانی میں اس نے ناکارہ گھڑے سمیت تمام گھڑوں میں پانی بھرا اور ریڑھے پر لاد کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر جب اس نے پانی سے بھرے گھڑے محفوظ جگہ پر رکھے تو شاہ کار گھڑے کو اُٹھاتے ہوئے اس کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔ پانی سے بھرا گھڑا گھر آتے آتے خالی ہو چکا تھا۔ اس میں پڑنے والی دراڑ میں سے پانی رسنے کی وجہ سے وہ گھڑا اب خالی ہو گیا تھا۔ پھر اس کا خیال اپنے بیٹے نواب کی جانب گیا کہ جب وہ اسکول سے واپس آئے گا تو اپنے گھڑے کو دیکھ کر کتنا افسردہ ہو جائے گا، کیوں نہ اس کے آنے سے پہلے ہی وہ اسی طرح کا ایک اور گھڑا تیار کر لے تاکہ اس کے بیٹے نواب کو پتا نہ چلے کہ اس کا پسندیدہ گھڑا اب ناکارہ ہو چکا ہے

مگر وقت کی کمی آڑے آ گئی تو اس نے یہ خیال اپنے دل سے نکال دیا۔ پھر اس نے ایک اور فیصلہ کیا کہ وہ اس گھڑے کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ روزانہ دوسرے گھڑوں کے ساتھ اسے بھی پانی بھرنے کے لیے لے جایا کرے گا اور جیسے ہی وقت ملا وہ اس جیسا ایک نیا گھڑا بنا کر پھر اس گھڑے کو ضائع کر دے گا۔ اس طرح اس کے بیٹے نواب کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ پھر اس کا معمول بن گیا کہ وہ روز اس گھڑے کو باقی گھڑوں کے ساتھ پانی بھرنے کے لیے لے جانے لگا۔ پانی بھرنے کے دوران دوسرے گھڑوں کے ساتھ ساتھ اس گھڑے میں بھی پانی بھر لیتا، جب کہ اسے معلوم بھی تھا کہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی یہ گھڑا پانی سے خالی ہو جائے گا۔ جب وہ اس شاہ کار گھڑے کو پانی سے بھرتا اور دوسرے گھڑوں کے ساتھ ریڑھے پر لادتا تو اس گھڑے میں سے قطرہ قطرہ پانی نیچے زمین پر گرتا رہتا تھا۔ ......☆......

وہ بھی معمول کا دن تھا جب وہ صبح سویرے اپنے راستے پر ریڑھا چلاتا ہوا ٹوبے کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ جس بنجر راستے سے وہ روزانہ گزرتا تھا آج اس بنجر اور خشک راستے پر خود رو پھول اور بوٹے اُگ آئے تھے۔ وہ قدرت کا یہ کرشمہ دیکھ کر حیران ہوا کیوں کہ گزشتہ دو سال سے ان پہاڑوں پر بارش نہیں ہوئی تھی، پھر بھی یہ پھول اور بوٹے کیسے اُگ آئے ہیں۔ چند دنوں میں وہاں پھولوں کی بہار ہی بہار تھی۔

اس رات اس کی نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ ان ہی خیالوں میں لیٹا تھا کہ یہ قدرت نے کیا نظارہ دکھایا کہ بنجر راستے کو پھولوں والا راستہ بنا دیا اور بغیر بارش کے خود رو پھول اُگا دیے۔ سوچتے سوچتے ایک دم بجلی کی سی تیزی سے بستر پر اُٹھ بیٹھا اور بھاگ کر اپنے گھڑوں کے نزدیک پہنچ گیا کیوں کہ یہ کمال اس شاہ کار گھڑے کا تھا جو اسے اور اس کے بیٹے نواب کا پسندیدہ گھڑا تھا۔ اس گھڑے میں سے قطرہ قطرہ گرنے والا پانی بنجر زمین میں جان ڈال گیا تھا۔ پیاسی زمین کو قطرہ قطرہ پانی کیا ملا کہ اس بنجر زمین نے خود رو پھولوں کو جنم دیا تھا۔

دتو کمہار اور گاؤں والے بارش کے منتظر رہتے تھے کہ بارش ہو اور بنجر زمین سبزہ اُگلے اور رنگ برنگے پھولوں سے بھر جائے۔ اب اس گھڑے نے بغیر بارش کے اس کی خواہش پوری کر دی تھی کہ جس راستے پر چلتا تھا وہاں پھولوں کی بہار کر دی تھی۔ دتو کمہار نے پانی بھرنے والے گھڑوں کے نزدیک جا کر "شاہ کار گھڑے" کی جانب دیکھا تو اسے ایسے لگا جیسے یہ گھڑا اسے پیار سے کہہ رہا ہو کہ کسی بھی چیز کو فالتو اور ناکارہ نہیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ دُنیا میں آنے والی ساری چیزیں کوئی نہ کوئی بھلا کرنے کے لیے آتی ہیں، جیسے میں نے بھلا کیا اور بنجر، پتھریلی زمین کو رنگ برنگے پھولوں سے سجا دیا۔

میجر راجا عزیز بھٹی شہید

آپ نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں دشمن کا بڑی جرأت اور بہادری سے مقابلہ کر کے جام شہادت نوش کیا۔ آپ نے دشمن کی ٹڈی دل فوج کا زبردست مقابلہ کیا۔ ان اعلیٰ خدمات کی بناء پر مرحوم کو نشانِ حیدر جیسے بلند اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا۔ میجر عزیز بھٹی لادیاں ضلع گجرات کے رہنے والے تھے ان کے والد راجا محمد عبداللہ بھٹی ہانگ کانگ چلے گئے، وہیں راجا عزیز بھٹی پیدا ہوئے۔ باقی تین بہن بھائی بھی ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے۔ 1946ء میں خاندان وطن واپس آ گیا۔ 1950ء میں ملٹری اکیڈمی کاکول سے کمیشن لیا جہاں انہیں سینئر انڈر آفیسر کا نمایاں اعزاز ملا۔ پاسنگ آؤٹ کی سلامی وزیر اعظم لیاقت علی خاں مرحوم نے لی اور اپنے ہاتھ سے عزیز بھٹی کو فارمن گولڈ میڈل اور اعزازی شمشیر دی۔ مرحوم اعلیٰ فوجی تربیت کے لیے امریکا اور جرمنی بھی گئے۔

بھارت نے ستمبر 1965ء میں جب لاہور پر حملہ کیا تو برکی سیکٹر میں ایک کمپنی کی کمان ان کے سپرد ہوئی۔ دشمن نے ایک ڈویژن فوج، توپ خانہ اور ٹینکوں سے حملہ کیا۔ میجر عزیز بھٹی اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے جوانوں سے آگے آگے رہے۔ 10، 11 ستمبر کو دشمن کی ایک بٹالین نے ان کے مورچے پر حملہ کر دیا۔ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ راوی بیدیاں نہر کے داہنے کنارے سے ہٹ کر بائیں کنارے پر آ جائیں۔ دشمن جب برکی کے گرد حلقہ کو تنگ کرتا ہوا نہر کے پُل پر پہنچ گیا تو میجر عزیز بھٹی کمپنی کے آخری دستے کے ساتھ واپس آئے۔ پُل پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس پر انہوں نے دو دستوں کی صفیں درست کیں اور دشمن پر حملہ کر دیا۔ ان کے پاس صرف اسٹین گن تھی۔ انہوں نے اس شدت سے حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے جس کے بعد انہوں نے اپنے جوانوں کو نہر کی دوسری جانب پہنچایا اور خود اس وقت تک دشمن پر گولیاں برساتے رہے جب تک ان کی کمپنی کے تمام جوان نہر عبور نہ کر گئے۔ نہر کے دوسرے کنارے پہنچ کر میجر عزیز بھٹی نے پھر اپنی صفیں درست کیں اور دشمن پر فائرنگ شروع کر دی۔ وہ بار بار اپنا سر نہر کے کنارے پر سے نکال کر دشمن کے ٹھکانوں کو دیکھتے اس کام کو خود میجر عزیز بھٹی نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور دشمن کے بڑھتے ہوئے حملے کو پسپا کر دیا۔ 12 ستمبر کو جب دشمن کے ٹینک اور فوج ان کی کمپنی پر حملہ کر رہے تھے۔ میجر عزیز بھٹی خود ٹینکوں سے گولے برسا رہے تھے۔ اچانک دشمن کا ایک گولہ ان کے دائیں کندھے پر گرا اور پاکستان کا یہ مایہ ناز سپوت شہید ہو گیا۔ آپ کو اپنے آبائی گاؤں ضلع گجرات میں دفن کیا گیا۔

بوجھ

گلاب خان سولنگی

''ابا جی! مجھے موٹر سائیکل چاہیے۔''

فرحان صاحب نے اخبار پڑھتے ہوئے، نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ ان کا نوجوان بیٹا ہاشم، منہ پھلائے کھڑا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ بہت ناراض ہے۔

''موٹر سائیکل کے لیے کچھ انتظار کر لو بیٹا۔'' فرحان صاحب نے تسلی دی۔

''کب تک انتظار؟ میرے سارے دوست میرا مذاق اُڑاتے ہیں کہ تمہارے ابو، تمہیں ایک موٹر سائیکل تک نہیں دلا سکتے۔'' ہاشم نے غصے سے کہا۔

''اچھا پرسوں تمہیں موٹر سائیکل مل جائے گی۔''

''کیا واقعی......؟'' ہاشم کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔

''ہاں، ہاں۔''

''ابا، بہت بہت شکریہ۔'' ہاشم خوشی خوشی چلا گیا۔ فرحان صاحب پھر اخبار پڑھنے لگے۔ ابھی وہ ایک خبر ٹھیک طرح نہ پڑھ سکے تھے کہ ان کی بیٹی نبیلہ آ گئی۔

''ابا جی، مجھے خوب صورت سا سوٹ چاہیے۔ میں اپنی دوست کی سال گرہ میں کیا پہنوں گی؟''

''بیٹے آپ کے پاس پہلے ہی دو نئے سوٹ ہیں۔''

''وہ میں کئی مرتبہ پہن چکی ہوں۔ آپ مجھے نیا سوٹ لے کر دیں۔''

''اچھا بھئی کل لے دیں گے۔''

''ابا جی، شکریہ بہت بہت۔'' فرحان صاحب پھر اخبار کی طرف متوجہ ہوئے کہ ان کی بیگم آ گئیں۔

''آپ کو تو ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ سب لوگوں نے اپنے گھر کا فرنیچر بدل لیا ہے، ہم پچھلے سال والا فرنیچر استعمال کر رہے ہیں اور آپ نے نئے ماڈل کی کار بھی نہیں خریدی۔ ابھی تک پچھلے سال کا ماڈل لیے بیٹھے ہیں۔ میں کہتی ہوں، آپ کوئی فکر کیوں نہیں کرتے؟''

فرحان صاحب مسکرائے اور بولے۔ ''فکر تو ہمیشہ رہتی ہے۔ میں فرنیچر کا آرڈر دے چکا ہوں، البتہ کار کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔''

''کوئی ٹیڑھا نہیں۔ آپ اتنے با اختیار افسر ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں۔'' فرحان صاحب کی بیگم بولیں۔ پھر انہوں نے بھی منہ بنا کر کہا۔ ''آپ کو کون سا اپنی بیگم کا خیال ہے، کبھی پوچھا کہ

شادی بیاہ میں پہننے کے کپڑے ہیں یا نہیں۔"

"اوہو...... بھئی بیگم! آپ جو چاہیں خرید لیا کریں، میں پیسے دے دوں گا۔" فرحان صاحب ذرا جھنجلا کر بولے۔

"اب بات ہوئی ناں!!" بیگم صاحبہ مطمئن ہو کر رات کا کھانا لگوانے چلی گئیں۔

فرحان صاحب یوں تو ایک سرکاری محکمے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے، مگر ان کے گھر اور رہن سہن کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک معمولی سرکاری افسر ہیں۔ ان کے ٹھاٹ باٹ اور عالی شان طرز زندگی کی وجہ یہ تھی کہ دفتر میں ان کے اختیارات بہت تھے۔ کئی منصوبوں کی فائلیں منظور کروانے کے لیے انہی سے رابطہ قائم کرنا پڑتا۔ جو شخص انہیں "خوش" کر دیتا، صرف اسی کی فائل "اوپر" جا سکتی تھی۔ اس لیے ہر آدمی ان سے اچھے تعلقات رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

فرحان صاحب، اگلے دن دفتر پہنچے۔ انہوں نے میز پر رکھی فائلوں کے ڈھیر میں سے چند فائلیں ڈھونڈ کر نکالیں۔

ان فائلوں سے فرحان صاحب کو "بڑا فائدہ" حاصل ہونے کی اُمید تھی۔ فرحان صاحب نے اپنے معاون سے کہا کہ وہ ان فائلوں کو دیکھے اور ان میں لگی درخواستوں کی مدد سے درخواست بھیجنے والوں سے رابطہ قائم کرے۔ معاون نے صرف دو گھنٹے میں سب سے رابطہ قائم کر لیا۔ دوپہر تک تمام افراد فرحان صاحب سے آ کر مل چکے تھے۔ "معاملے" کی بات ہو گئی تھی۔ پارٹیوں نے پیشگی (ایڈوانس) رقم بھی دے دی تھی۔ باقی رقم "کام" ہو جانے کے بعد ملنی تھی۔

فرحان صاحب نے اطمینان بھرا سانس لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اسی وقت ان کے معاون نے ادب سے کہا۔

"سر! ایک بڑے میاں، ملنا چاہتے ہیں۔"

"افوہ...... ایک تو لوگوں کو تمیز نہیں، جب دیکھو چلے آتے ہیں۔"

"سر! کوئی ضرورت مند لگ رہا ہے۔ ممکن ہے زیادہ پیسے خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہمارا بھی کچھ فائدہ ہو جائے گا۔" معاون نے توجہ دلائی۔

"اوہ، ہاں...... اچھا! تو بلاؤ۔"

بڑی عمر کے ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ سر اور داڑھی کے سارے بال سفید تھے۔ آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ اور سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔ شاید دفتر کی سیڑھیاں چڑھنے سے ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"تشریف رکھیے۔" فرحان صاحب نے بڑے میاں کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے، گھڑی پر نظر ڈالی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ جلدی میں ہیں اور لمبی بات نہیں کرنا چاہتے۔ بڑے میاں نے بات شروع کی۔ ان کی کوئی بے حد ضروری فائل فرحان صاحب کے محکمے میں کئی ماہ سے اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بیٹوں کو کئی بار بھیج چکے تھے، مگر یہاں کوئی سننے والا ہی نہ تھا۔ آخر بڑے میاں کو خود آنا پڑا تھا۔

"دیکھیے بزرگو! آپ نے بھی دُنیا دیکھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے ہر شخص کے ساتھ ضرورتیں لگی ہوتی ہیں۔ اب گورنمنٹ کی سوکھی تنخواہ میں تو گزارہ نہیں ہوتا۔ ہم بھی ماشاء اللہ بال بچے دار

ہیں۔ بچوں کی تعلیم ہے، گھر کے اخراجات ہیں، بیوی بچوں کی سو فرمائشیں ہیں۔ سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آخر معاشرے میں ہماری کوئی عزت ہے۔ پھٹے ہوئے اور پیوند لگے کپڑے پہن کر تو شادی بیاہ میں نہیں جا سکتے۔ آپ بھی ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں۔''

''جی، جی...... میں سب سمجھتا ہوں لیکن میں آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

''نقصان؟''

''جی ہاں، میں اگر آپ کی اور آپ کے بیوی بچوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں آپ کی مدد کرنے لگوں تو، میں آپ کو نقصان ہی پہنچاؤں گا۔''

''اوہو! بھئی آپ تو پہیلیوں میں باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں ایک سرکاری افسر ہوں اور میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ سمجھے آپ؟''

''بالکل سمجھ گیا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اللہ نے آپ کو اس کرسی پر اس لیے بٹھایا ہے کہ آپ اپنا قیمتی وقت لوگوں کے مسائل حل کرنے میں استعمال کریں۔''

فرحان صاحب کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو گیا۔ وہ کوئی سخت بات کہنے ہی والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

فرحان صاحب ابھی غصے کے اثر سے باہر نہیں نکلے تھے، فون کا ریسیور اٹھا کر دھاڑے۔ ''ہیلو! کیا؟ کون؟ فرنیچر ہاؤس سے ملک صاحب بول رہے ہیں۔ اچھا تو فرنیچر تیار ہے؟ بہت خوب! فرنیچر آپ گھر بھجوا دیجیے...... شکریہ بہت بہت، اللہ حافظ۔''

فرحان صاحب نے فون کا ریسیور رکھا تو بڑے میاں بولے۔ ''میں آپ کا قیمتی وقت مزید برباد نہیں کرنا چاہتا۔ معلوم نہیں آپ کی زندگی کتنی رہ گئی ہے، بہرحال جتنی بھی رہ گئی ہے، اس میں مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ نے جو فرنیچر بنوایا ہے، وہ یقیناً بہت عمدہ اور قیمتی ہوگا؟''

''ہاں! ہے، تو پھر؟'' فرحان صاحب ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔

''کیا آپ اکیلے اس فرنیچر کو اُٹھا لیں گے؟''

''کیا بکواس ہے۔ میں کیسے اُٹھا سکتا ہوں۔ مزدور کس لیے ہیں؟'' فرحان صاحب بیزاری سے بولے۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر پھر نظر ڈالی۔

''آپ نے درست فرمایا۔'' بڑے میاں بولے۔ ''آپ خود فرنیچر کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔ مزدور یہ بوجھ اُٹھا لیں گے لیکن میں آپ کو قرآن مجید کی سورۃ فاطر کی ایک آیت کا ترجمہ سناتا ہوں۔ یہ آیت نمبر اٹھارہ ہے۔ چھوٹی سی ہے، سن لیجیے۔'' بڑے میاں نے ذرا رُک کر فرحان صاحب کی طرف دیکھا، جو شاید فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ بڑے میاں کو قرآنی آیت کا ترجمہ سنانے سے روکیں یا نہ روکیں۔ بڑے میاں بولے:

''سنیے! اس آیت کا ترجمہ ہے، جس میں آخرت کا ذکر ہے:

''کوئی بوجھ اُٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا، اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اُٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بوجھ کا ایک ادنیٰ حصہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا، چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔''

''اچھا! اب میں چلتا ہوں۔ اللہ آپ کو نورِ ہدایت عطا فرمائے، آپ کا بہت وقت لیا۔ اللہ حافظ!'' فرحان صاحب کو پتا ہی نہ چلا، کب بڑے میاں الوداعی کلمات کہہ کر چلے گئے۔ فرحان صاحب کو تو یوں لگ رہا تھا کہ ان کی رگوں میں لہو کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

بے بسی کے عالم میں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا۔ انہوں نے فوراً وضو کیا اور جائے نماز پر توبہ کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ انہیں یوں لگا جیسے ان کے سر پر بہت وزنی بوجھ اُٹھ گیا ہو۔ انہوں نے فوراً گاڑی نکالی اور گھر کی طرف چل پڑے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کا دل کائنات کے بے حد رحیم و کریم مالک کے حضور جھکا جا رہا ہے۔ ☆☆☆

معلوماتِ عامہ

☆ چین میں Three Gorges Dam کا تعمیراتی پراجیکٹ جو زیرِ تعمیر ہے، دُنیا کا سب سے بڑا تعمیراتی پراجیکٹ ہے۔

☆ Ames and Noble بک سٹور نیویارک سٹی (امریکہ) دُنیا میں کتب کی سب سے بڑی دُکان ہے۔

☆ جنوبی چین کا سمندر دُنیا کا سب سے بڑا سمندر ہے۔

☆ بحرِ ہند دُنیا کے تین بڑے سمندروں میں سے ایک ہے۔

☆ صحارا (صحرائے اعظم) دُنیا کا سب سے بڑا ریگستان ہے۔

☆ رشین فیڈریشن رقبہ کے لحاظ سے دُنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔

☆ ویٹی کن سٹی رقبہ کے لحاظ سے دُنیا کا سب سے چھوٹا ملک ہے۔

☆ 4 جنوری 2010ء کو دبئی میں دُنیا کی سب سے بڑی عمارت ''برج الخلیفہ'' کا افتتاح ہوا جس کی بلندی 828 میٹر ہے۔ اس کی 160 منازل اور 56 لفٹیں ہیں۔

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ آدھی رات کے سورج کی سرزمین کسے کہتے ہیں؟

i۔ جرمنی ii۔ ناروے iii۔ فن لینڈ

2۔ انسانی جسم کا سب سے بھاری عضو کون سا ہے؟

i۔ دل ii۔ جگر iii۔ دماغ

3۔ آدم ثانیؑ کس پیغمبر کا لقب ہے؟

i۔ حضرت عیسیٰؑ ii۔ حضرت شیثؑ iii۔ حضرت نوحؑ

4۔ محاورہ مکمل کیجیے:

سر منڈواتے ہی .... پڑے۔

5۔ ذیل میں کون سی چیز پانی میں زیادہ تیز سفر کرے گی؟

i۔ لوہا ii۔ آواز iii۔ لکڑی

6۔ یہ شعر بانگ درا سے لیا گیا ہے، مکمل کیجیے:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر ....

7۔ دُنیا کا سب سے بڑا صحرا کون سا ہے؟

i۔ صحرائے عرب ii۔ صحارا iii۔ صحرائے گوبی

8۔ ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے تک کے وقت کو کس چیز سے ناپا جا سکتا ہے؟

i۔ کرونو میٹر ii۔ اٹامک گھڑی iii۔ اصطرلاب

9۔ خدا کا جلوہ دیکھنے کے بعد کوہ طور کس چیز میں تبدیل ہو گیا تھا؟

i۔ چاندی ii۔ سرمہ iii۔ سونا

10۔ دُنیا کا سب سے لمبا بیراج کون سا ہے؟

i۔ کوٹری بیراج ii۔ سکھر بیراج iii۔ وارسک بند

جوابات علمی آزمائش اپریل 2016ء

1۔ کلمہ تمجید 2۔ بہاول پور 3۔ قائداعظمؒ 4۔ نیوٹن 5۔ ذوق
6۔ بالِ جبریل 7۔ خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی 8۔ ایوب خان
9۔ زرافہ 10۔ ایشیاء

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ حیدر علی حجازی، لاہور (150 روپے کی کتب)

☆ عبدالرحمٰن رضا، خان بیلہ (100 روپے کی کتب)

☆ ماریہ اعظم، قلعہ دیدار سنگھ (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

امامہ شیر، فیصل آباد۔ خدیجہ نشان، نفیسہ فاطمہ قادری، عائشہ فاطمہ، کاموکی۔ مریم قاسم، گوجرانوالہ۔ محمد اسعد، کراچی۔ شیزہ جاوید، گوجرانوالہ۔ سیدہ امامہ تنویر، کراچی۔ طوبیٰ راشد، حیدر علی، لاہور۔ محمد احمد خاں غوری، بہاول پور۔ دانیال آصف، راول پنڈی۔ زین العابدین، اسلام آباد۔ عافیہ غزالی، اسلام آباد۔ محمد احمد رضا، دنیا پور۔ ملک محمد احسن، شاہ زیب احمد، راول پنڈی۔ طاہر علی ضیاء، اسلام آباد۔ آسیہ کلثوم، صادق آباد۔ عبدالرافع خان، اسلام آباد۔ محمد فہد بٹ، جہلم۔ خالد خان کوہاٹ۔ اسامہ بن آصف، پشاور۔ آفتاب عدیل، لاہور۔ علینا اختر، کراچی۔ طوبیٰ زہرہ، جھنگ۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ عدن سجاد، جھنگ۔ مناہل نسیم، اسلام آباد۔ فاطمہ اظہار، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ نجم الحر، ملک وال۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور۔ تہنیت آفرین، منڈی بہاؤ الدین۔ اقراء مطلوب، قریشی۔ میر پور، آزاد کشمیر۔ عزا فاطمہ، گوجرانوالہ۔ محمد یاسر، کرک۔ محمد عمر جاوید، گوجرانوالہ۔ مومنہ عامر حجازی، لاہور۔ عائشہ صدیقہ، اسلام آباد۔ رمین زہرہ، بہاول پور۔ خدیجہ نشان، محمد صفدان رضا قادری، کاموکے۔ رافعہ حبیب، لاہور۔ کرن اقبال، میانوالی۔ محمد صدیق قیوم، قصور۔ وردہ انمول، سیال کوٹ۔ راحیل خیام، راول پنڈی۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ میمونہ ضیاء، حافظ آباد۔ کشف طاہر، لاہور۔ آمنہ مظہر، لاہور۔ حفصہ اعجاز، صوابی۔ محمد عثمان غنی، بہاول پور۔ محمد حسین شاہ، کراچی۔ عمیر مجید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ مشعال آصف، لاہور۔ محمد عمر دلدار، فیصل آباد۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ طیبہ ارشد، شرق پور شریف۔ ایمان فاطمہ، لاہور۔ عارفہ شیخ، حیدر آباد۔ شیرونیہ ثناء، لطیف آباد۔ ضیاء الحسن شاہ، ڈی آئی خان۔ وجیہہ شہباز، وہاڑی۔ احمد عبداللہ، میانوالی۔ منصور اعجاز، بہاول نگر۔ الماس مریم، چکوال۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ محمد عثمان، واہ کینٹ۔ اسامہ خباب علی، تلہ گنگ۔ رامین رضوان، راول پنڈی۔ اقراء صدیق، لاہور۔ سید حذیفہ مستنصر، لاہور۔ عمر مدثر، سیال کوٹ۔ سمیرا بنت یوسف، کراچی۔ ربیعہ اقبال، کراچی۔

اَلْوَارِثُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(سب کے بعد موجود رہنے والا)

اَلْوَارِثُ جَلَّ جَلَالُہٗ ساری مخلوق کے فنا ہو جانے کے بعد بھی باقی رہیں گے اور تمام چیزوں کے مالک بھی وہی رہیں گے۔ جسے چاہیں اسے چیزوں کا مالک بنا دیں۔

اللہ تعالیٰ کا ایک نام اَلْوَارِثُ جَلَّ جَلَالُہٗ ہے۔ اس لیے کہ دُنیا کا جتنا مال ہے اس کے مالک ایک دن سب ختم ہو جائیں گے، تو آخر میں ایک اللہ تعالیٰ ہی اس سب مال کے مالک اور وارث ہوں گے، بلکہ ساری دُنیا کے بادشاہوں کی بادشاہت کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں۔ جو بادشاہ اپنے آپ کو کسی ملک کا بادشاہ کہتے ہیں اور اس پر بڑا غرور کرتے ہیں، یہ سب بادشاہ اپنی بادشاہت سمیت فنا اور ختم ہو جائیں گے۔ جب ہر چیز ختم ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے ''کس کی بادشاہی ہے آج؟'' لیکن کوئی جواب دینے والا نہ ہو گا۔ ہر طرف خاموشی ہو گی، پھر وہ خود ہی فرمائیں گے کہ

''صرف اللہ کی جو واحد و قہار ہے۔''

بنجر زمین

سعید اور ارشد دونوں گرمی کی چھٹیاں منانے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ دونوں شام کے وقت اپنے چچا کے بیٹے احسان کے ساتھ کھیلنے اور کبھی سیر و تفریح کرنے نکل جاتے۔ آج انہوں نے نہر کی طرف گھومنے کا پروگرام بنایا۔ اس گاؤں کا نام ''الہ آباد'' تھا۔ گاؤں سے بیس منٹ کے فاصلے پر ایک نہر بہہ رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے تینوں دوست نہر تک پہنچ چکے تھے۔ چاروں طرف سرسبز و شاداب لہلہاتی خوب صورت کھیتیاں تھیں۔

''ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ سبزے کو دیکھنا آنکھوں کے لیے مفید ہے۔'' ارشد نے کہا۔

''احسان! تم لوگ بہت خوش قسمت ہو کہ ہریالی ہی میں رہتے ہو، ہم لوگ تو شہروں میں کھیتوں اور باغات کو دیکھنے کے لیے ترس جاتے ہیں۔'' سعید نے کہا۔

''آؤ دوست! نہر کے اس پار چلتے ہیں۔'' سعید نے کہا۔ تینوں ایک پل سے نہر پار کرنے لگے۔ نہر کے دوسری طرف بھی سرسبز کھیتیاں ہی کھیتیاں تھیں۔ نہر کے ساتھ بنے ہوئے ایک چھوٹے سے نالے کے کنارے کے ساتھ مینڈک کے ''ٹرٹر'' کی آواز وقفے وقفے سے گونج رہی تھی۔

''ارے! اتنی ساری سرسبز کھیتیوں کے درمیان یہ زمین بنجر

کیوں ہے؟'' ارشد نے حیرت سے پوچھا۔

''اس زمین پر تو لگ رہا ہے کہ برسوں سے کوئی کھیتی نہیں اُگی۔'' سعید نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''سرسبز زمین کے درمیان یہ بنجر زمین بہت بدصورت لگ رہی ہے اور اس سارے منظر کو ایک گرہن لگا رہی ہے، جیسے چاند کو گرہن لگ جاتا ہے۔'' احسان نے کہا۔

''میں بتاتی ہوں کہ میں بنجر کیوں ہوں۔'' بنجر زمین سے آواز آنے پر وہ تینوں حیرت زدہ ہو گئے۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں تمہاری حیرت دُور کیے دیتی ہوں۔ میری کہانی بڑی عبرت ناک ہے۔ تم سن لو اور لوگوں کو جا کر سناؤ۔'' پھر وہ تینوں بنجر زمین کی کہانی بہت حیرت سے سننے لگے۔

''میرے مالک کا انتقال ہو گیا، اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد میری زمین میں دو بیٹے اور ایک بیٹی بھی حصہ دار تھے۔ اس کے انتقال کو دو ماہ ہو گئے تھے۔ مسجد کے عالم صاحب نے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا:

''تمہارے والد میرے اچھے دوست تھے، اس لیے میرا ایک ہمدردانہ مشورہ ہے کہ تم دونوں اس زمین کا اسلامی تعلیم کے مطابق اپنا اپنا حصہ لے لو اور اپنی بہن کو بھی اس کا حصہ دے دو۔''

یہ سنتے ہی بڑا بیٹا ناراض ہو گیا اور کہنے لگا: ''اس کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی تو ہمارے والد کا کفن تک میلا نہیں ہوا، ہم تو اس طرح نہیں کرتے۔''

عالم صاحب اس بات پر خاموش ہو گئے مگر کچھ عرصے بعد بڑے بیٹے کی نیت میں کھوٹ آ گیا، جب اس کے چھوٹے بھائی نے مطالبہ کیا کہ اس کی بہن کو حصہ ضرور دیا جائے۔

بڑے بھائی نے ایک سازش کرتے ہوئے چھوٹے بھائی کو ختم کرا دیا تاکہ یہ ساری زمین اسے مل جائے مگر وہ اپنی چال میں بُری طرح ناکام ہو گیا۔ والدہ نے یہ سب دیکھ لیا۔ پولیس قتل کے الزام میں بڑے بیٹے کو جیل لے گئی اور چھوٹا بیٹا قبر تک پہنچ گیا۔ ماں اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور صدمے سے پاگل ہو گئی اور بہن کو بھی بہت صدمہ پہنچا۔ اگر عالم صاحب کا مشورہ مان لیا جاتا تو مال کی محبت میں اس نوبت تک نہ پہنچتے مگر اس وقت بڑے بیٹے کو یہ یاد آ گیا کہ اب تک باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔

''اے دوستو! ساری دُنیا کے لوگوں کو بتاؤ کہ جس زمین، دُکان، مکان کی وجہ سے کوئی قاتل کسی کا خون بہاتا ہے، ایک دن یہ زمین، مکان، دُکان سب اس کے ساتھ بے وفائی کر جائیں گے۔ قاتل کے کسی کام نہ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اسے جواب دینا ہو گا۔''

بنجر زمین نے اپنی کہانی ختم کی تو تینوں دوست حیران و پریشان کھڑے تھے۔ مغرب کے وقت وہ ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ...... اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کی آواز پر اپنے گاؤں کی جانب اس عزم سے پلٹے کہ آج ہی بنجر زمین کے اس عبرت ناک واقعے کو ایک کہانی کی صورت میں لکھ کر شائع کریں گے تاکہ ہمارے دوستوں اور ہماری عمر کے لڑکوں کے دلوں میں ابھی سے ہی ان چیزوں کی محبت نہ رہے اور ہم ان چیزوں کے لیے آپس میں گالم گلوچ اور لڑائی تک نہ پہنچیں۔

بہترین وارث

یہ دعا خود بھی مانگیے اور والدین اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی بتایئے۔ ہماری چیزوں کے مالک تو اللہ تعالیٰ ہیں، اس لیے یہ دُعا مانگ کر اللہ تعالیٰ کو وارث بنایئے۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ۔

ترجمہ: ''یا رب! مجھے اکیلا نہ چھوڑیے اور آپ سب سے بہتر وارث ہیں۔''

یاد رکھنے کی باتیں

1- جو چیزیں ہمارے پاس ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہمیں ملی ہیں۔ اگر ہمارے پاس گاڑی یا کوئی ایسی چیز ہو جو دوسروں کے پاس نہیں ہے تو ہم اپنی گاڑی کے ہوتے ہوئے غرور نہ کریں اور دوسرے غریب مثلاً گدھا گاڑی والے اور موچی کو کم تر نہ سمجھیں۔

2- ہم پکا ارادہ کریں کہ عالم بنیں گے۔ اگر عالم نہ بنیں تو علمائے کرام سے پوچھ پوچھ کر اپنی زندگی گزاریں گے۔

3- یہ پکی نیت کر لیں کہ جائیداد میں جو حصہ بہن کا بنے گا وہ ہم خوشی سے اور ضرور ادا کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

☆☆☆

ٹائم مشین

نسرین نکہت سبزواری

وہ عموماً اس وقت گھر سے نکلتا تھا جب لوگ ابھی سو رہے ہوتے تھے اور گلیاں سنسان ہوتی تھیں۔ وہ اکثر اسکول کے وقت سے کم از کم ایک گھنٹا پہلے اسکول پہنچ جاتا تھا اور یہ ایک گھنٹا وہ کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر سبق یاد کرنے یا کوئی کتاب پڑھنے میں گزار دیتا تھا۔ ان کوششوں کے باوجود وہ زہریلے جملے اس کے کانوں میں پڑ ہی جاتے تھے جن سے اس کا دل چھلنی ہو جاتا تھا اور روح تک زخمی ہو جاتی تھی۔ ”ارے وہ جا رہا ہے قاتل کا بیٹا۔ اس کے باپ نے اسے قتل کر دیا اور خود سولی پہ چڑھ گیا۔ یہ خود بھی منحوس ہے۔“

کچھ لوگ تو پورے یقین سے کہہ دیتے تھے کہ قاتل کا بیٹا قاتل ہی ہوگا۔ ”اس کی رگوں میں بھی تو ظالم اور مجرم باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔“

اس قسم کی باتیں وہ اس وقت سے سنتا آ رہا تھا جب سے وہ سننے اور سمجھنے کے قابل ہوا تھا۔ لوگوں کے اس رویے نے اسے بالکل تنہا کر دیا تھا۔ اس کی عمر کے بچوں کو ان کے والدین اس کے قریب آنے نہیں دیتے تھے۔ اسکول میں بھی وہ اکیلا اور سہما سہما سا رہتا تھا کہ وہاں بھی کسی کو اس کے والدین کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے۔ دو تین سال تو خیریت رہی پھر کمال دین ٹھیکے دار جو اسی محلے میں رہتا تھا، کا بیٹا جمال دین اس کی جماعت میں داخل ہو گیا تو سب کو اس کے متعلق معلوم ہو گیا۔ جمال کو نہ جانے اس سے کیا دشمنی تھی۔ جیسے ہی وہ کمرۂ جماعت میں داخل ہوتا، سب سے پہلے یہی جملہ سننے کو ملتا۔ ”قاتل باپ کا بیٹا قاتل۔“ اس کے ساتھ ہی پوری جماعت میں ایک تمسخر آمیز قہقہہ گونج اُٹھتا۔ ماسٹر صاحب اگر کلاس روم میں ہوتے تو سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا دیتے مگر وہ جمال کو کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیوں کہ وہ پوری جماعت میں بلکہ پورے اسکول میں واحد لڑکا تھا جس کا باپ وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقمیں چندے کے طور پر اسکول کو دیا کرتا تھا۔ وہ ایک بڑی سی کار میں اسکول آتا جاتا تھا اور اس کا ڈرائیور اس کا بیگ اُٹھا کر اسے کلاس روم تک چھوڑنے آتا تھا۔ دولت اور شان و شوکت کے ان مظاہروں کے علاوہ جمال نہ صرف خود آدھی چھٹی کے دوران اسکول کینٹین سے برگرز اور کولڈ ڈرنکس خریدتا تھا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی دعوت دے ڈالتا تھا، اس لیے زیادہ سے زیادہ لڑکے اس کی ٹولی میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ کون اتنا بے وقوف تھا کہ جمال کو چھوڑ کر ولی محمد کے ساتھ رہتا۔ ایک دن جب ولی محمد کی قوت برداشت جواب دے گئی تو وہ بغیر سوچے سمجھے جمال سے اُلجھ پڑا۔ باوجود جسمانی طور پر کمزور ہونے کے اس نے جمال کو چت کر دیا اور اس

کے سینے پر چڑھ بیٹھا مگر اس کی اس حرکت نے اسے اُستادوں کی نظر میں مجرم بنا دیا۔ لڑکے آتے جاتے اسے 'شیطان کا ولی' کہہ کر چھیڑتے۔ وہ کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیوں کہ وہ دُنیا میں بالکل بے سہارا تھا۔

سنا تھا کہ وہ اس وقت صرف ڈیڑھ سال کا تھا جب اس کے باپ نے اس کی ماں کو قتل کیا تھا اور پولیس اسے پکڑ کر لے گئی تھی۔ وہ نہ جانے کتنی دیر تک چارپائی پر اکیلا پڑا روتا رہا تھا۔ جب ماسی نوراں اس کے گھر میں داخل ہوئی تو وہ چارپائی سے نیچے گر پڑا تھا اور بلک بلک کر رو رہا تھا۔ مکھیاں اس کے منہ پر بھنبھنا رہی تھیں۔ وہ تو اتنا چھوٹا تھا کہ مکھیوں کو بھی نہیں اُڑا سکتا تھا۔ ماسی نوراں ایک نیم پاگل سی عورت تھی اور لوگ اس سے دُور دُور ہی رہتے تھے لیکن یہ نیم پاگل عورت ولی محمد کے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئی۔ وہ ولی محمد کو اُٹھا کر اپنے گھر لے آئی اور خاموشی سے اس کی پرورش کرنے لگی۔ نوراں کو کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے ولی محمد کے گھر آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ لوگ پہلے اس سے کنارہ کش رہتے تھے اب کچھ اور دُور ہو گئے تھے مگر وہ اس محلے میں اکیلی بھٹیارن تھی۔ اس کے بغیر لوگوں کا اور خاص طور سے عورتوں کا گزارہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے وہ گرمیوں کی تپتی دوپہروں اور جھلستی شاموں میں روٹی پکانے سے بچ جاتی تھیں۔ ولی محمد کے آنے نے ماسی نوراں کی کمائی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ خود کو بھول کر اور اپنی ضرورتیں پس پشت ڈال کر وہ ولی محمد کو پروان چڑھاتی رہی اور ولی محمد بُرے بھلے پلتا رہا۔ جب ولی محمد پانچ سال کا ہوا تو ماسی نوراں نے اپنا گلّہ توڑا اور اپنی تمام عمر کی پونجی لگا کر اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ یوں ولی محمد دُنیا کی زہر بھری نفرتوں اور ماسی نوراں کی بے غرض شفقتوں کے زیرِ سایہ زندگی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ اب ولی محمد اتنا سمجھ دار ہو گیا تھا کہ ماسی کے لیے اس کی تعلیم کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ چناں چہ وہ منہ اندھیرے اُٹھ کر منڈی جانے لگا اور محنت مزدوری کر کے ماسی نوراں کا بوجھ ہلکا کرنے لگا۔ ولی محمد کا کوئی دوست نہیں تھا، اس لیے اس نے کتابوں سے دوستی کر لی۔ اس کے پاس کتابیں خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنا فارغ وقت زیادہ تر اسکول کی لائبریری میں گزارتا تھا اور کبھی لائبریری سے کتابیں ایشو کروا کے گھر بھی لے آتا تھا۔ ولی محمد کتابوں کو بہت پیار سے سنبھال کر رکھتا اور وقت پر لائبریری کو واپس کر دیتا جب کہ دوسرے لڑکے کتابوں کو خراب کرتے اور اکثر غائب کر جاتے تھے۔ ولی محمد کو کتابوں کو ایشو کروانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھار وہ زیادہ محنت مزدوری کر کے اُردو بازار کے فٹ پاتھوں پر بکنے والی پُرانی کتابیں خرید لاتا تھا۔ اس کو زیادہ دل چسپی سائنس کی کتابوں سے تھی۔ ایک کتاب کے مطالعے کے دوران اس نے ٹائم مشین کے بارے میں پڑھا۔ ٹائم مشین وہ مشین ہے جس کے ذریعے آپ کسی بھی پُرانے دور میں پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں سے مل سکتے ہیں اور ان کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ ولی محمد کئی دن تک اس کتاب کو پڑھتا رہا۔ اس کے دل میں عجیب سی خواہش پیدا ہوئی، کاش وہ بھی ٹائم مشین کے ذریعے اس زمانے میں جا سکتا جب اس کے ماں باپ زندہ تھے۔ وہ ان کے بارے میں جان سکتا کہ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بناء پر اس کے باپ نے اس کی ماں کو قتل کر دیا اور خود موت کی سزا پانا منظور کر لیا اور اس کی زندگی کو دُنیا کی نظروں میں باعث ذلت بنا گیا۔ وہ اسے منحوس سمجھنے کے علاوہ اس کے کردار پر بھی شک کرتے تھے۔ اس کا بے اختیار دل چاہتا کہ وہ ان تمام لوگوں کو قتل کر دے، چاہے خود پھانسی پر چڑھ جائے لیکن یہ عمل اسے دُنیا کی نظروں میں اور معتوب تو کر سکتا تھا، اس کے والدین کے کردار کو شفاف نہیں بنا سکتا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ ولی محمد پڑھائی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں یکساں طور پر بہترین تھا۔ وہ ہر سال اپنی جماعت میں پوزیشن لیتا تھا۔ وہ ایک اچھا مقرر بھی تھا۔ اس نے اسکول کے لیے کئی ٹرافیاں جیتی تھیں۔ اس کے علاوہ ایک بہت اچھا ایتھلیٹ بھی تھا، مگر اس کی ذہانت اور قابلیت بھی اسے سب کی نظروں میں معتبر نہیں بنا سکی تھیں۔

اسے انعام کے علاوہ مہمان خصوصی کی طرف سے چند تعریفی جملے ضرور سننے کو ملتے تھے۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہیں، اُستادوں سے شاباشی بھی نہیں ملتی تھی کیوں کہ وہ بھی اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کے حالات سے لڑتے مرتے وہ میٹرک تک پہنچ گیا تھا۔ دُنیا میں صرف ماسی نوراں تھی جو اس کے میڈلز اور انعامات دیکھ کر ان کی اہمیت سمجھے بغیر اسے گلے لگا لیتی تھی اور اسے بے شمار دعائیں دیتی تھی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اس سے محبت کرنے والی واحد ہستی بھی تو معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی ایک حقیر عورت تھی۔ ولی محمد کو اپنا مستقبل بالکل تاریک نظر آتا تھا۔ اسے

یقین نہیں تھا کہ اس کا ماضی ہمیشہ اس کے ساتھ نہیں رہے گا اور وہ دُنیا میں کوئی مقام حاصل کر سکے گا۔ پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ سے دعا ضرور کرتا تھا۔ اگر وہ پڑھائی میں محنت کرتا تھا تو صرف اس لیے کہ اس کے سوا وہ اور کرتا بھی کیا۔ ٹائم مشین کے بارے میں پڑھ کر اس کے دل میں ایک موہوم سی اُمید پیدا ہوئی۔ معلوم نہیں کیوں اسے پورا یقین تھا کہ اس کے ماں باپ کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے وہ سچ نہیں ہے لیکن اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس کی بناء پر وہ دُنیا پر ان کی بے گناہی ثابت کر سکتا۔ ٹائم مشین نے اس کے دل میں آس کی ایک جوت جگا دی تھی۔ وہ دن رات ٹائم مشین کے بارے میں سوچتا اور پڑھتا رہتا۔ کبھی کبھی تو ٹائم مشین اس کے تصور میں آ جاتی اور اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی کہ کاش اسے سچ مچ ایسی مشین مل جائے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ آج بھی ولی محمد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اکثر جب ولی محمد بستر پر لیٹتا تو باوجود بے حد تھکن کے ماضی کی تلخیاں اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگتیں اور اس کی نیند اُڑ جاتی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے توجہ ہٹانے کے لیے کتاب اُٹھائی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وہی ٹائم مشین کے متعلق کتاب تھی جو آج کل وہ پڑھ رہا تھا۔ یوں کافی دیر گزر گئی۔ پڑھتے پڑھتے اس نے یوں ہی اپنی لوہے کی ٹوٹی پھوٹی میز پر سر رکھ دیا اور گہری نیند سو گیا۔ پتا نہیں وہ خواب تھا یا حقیقت تھی، وہ اپنے ہی محلے میں تھا، لوگ آ جا رہے تھے۔ اس نے ایک راہ گیر سے اپنے باپ کے گھر کا پتا پوچھا۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ہی گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ دستک دینے پر ایک خوش شکل آدمی نے دروازہ کھولا۔ ولی محمد نے اپنا تعارف کرایا تو اس شخص نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ تیز دھوپ میں ایک لمبی مسافت طے کر کے کسی گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں آ گیا ہو۔

''اری نجمہ! بھئی کہاں ہو؟ دیکھو ہمارا بیٹا آیا ہے! دیکھو تو کتنا بڑا ہو گیا ہے۔'' اس کے باپ کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔ اسی لمحے ایک خوب صورت عورت سفید سادہ لباس میں ملبوس اندر سے آئی۔ اس نے تڑپ کر اسے اپنا ساتھ چمٹا لیا اور رونے لگی، پھر سنبھل کے بولی۔

''آؤ بیٹا! میری جان اندر آ جاؤ، میں تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔'' وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ چھوٹا سا مگر صاف ستھرا گھر تھا۔ پچھلی طرف چھوٹا سا صحن تھا۔ ایک کونے میں سرخ پھولوں سے لدا ہوا ایک سرسبز و شاداب درخت کھڑا تھا۔ اس کی شاخوں پر بہت سی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ صحن کے تینوں طرف کیاریوں میں موسمی پھول کھلے ہوئے تھے۔ صحن کی صاف شفاف سرخ اینٹیں چمک رہی تھیں۔ درخت کے نیچے دو تین کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا تخت بچھا تھا، سامنے ہی باورچی خانہ تھا۔ چولہے پر مٹی کی ہانڈی میں کوئی چیز پک رہی تھی جس کی خوش بو سارے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ ولی محمد نے اپنی

ماں کی طرف دیکھا۔ ''امی زوروں کی بھوک لگی ہے، آپ نے کیا پکایا ہے؟'' ماں نہال نہال ہو گئی۔ ''ماں صدقے، میرے لال! تم یہاں بیٹھو، میں تمہارے لیے روٹیاں ڈالتی ہوں۔ سالن تو بس تیار ہی ہے۔'' کھانا کھا کر ولی محمد کو بہت مزہ آیا، پھر ابو اس کے لیے مٹھائی لے آئے۔ جب وہ تینوں اطمینان سے بیٹھے تو ولی محمد نے دل کی بات ان کے سامنے کھول کے رکھ دی۔

''خدا کے لیے مجھے بتایئے بابا آپ کے اور امی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ دُنیا نہ جانے آپ دونوں کے بارے میں کیا کیا کہتی ہے۔ میں نے تو تمام عمر شرمندگی اور رسوائی میں گزاری ہے۔ محلے والے مجھے قاتل باپ اور بُری ماں کا بیٹا کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سب جھوٹ کہتے ہیں، مگر میرے پاس آپ دونوں کی بے گناہی کا ثبوت بھی تو نہیں۔ پلیز بابا! مجھے بتایئے، سب کچھ بتایئے۔ چاہے حقیقت کتنی ہی بھیانک کیوں نہ ہو۔'' ان دونوں نے اسے باری باری ایک بار پھر گلے لگایا۔ اس کا ماتھا بار بار چوما۔ ولی محمد کو ایسا لگ رہا تھا جیسے آہستہ آہستہ اس کے زخم مندمل ہو رہے ہوں۔ پھر اس کے بابا نے اسے پوری کہانی سنائی۔

''یہ تمہاری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔ میں ان دنوں بے روزگار تھا۔ پھر مجھے پولیس میں ایک مخبر کی نوکری مل گئی۔ میرا کام تھا کہ میں دہشت گردوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں اور پولیس کو فراہم کروں۔ میری ایک درست خبر پر دہشت گردی کا ایک حملہ ناکام ہو گیا۔ بروقت اطلاع ملنے پر لوگوں کو جائے وقوع سے ہٹا لیا گیا۔ خودکش بمبار مارا گیا اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ دو دہشت گرد پکڑے بھی گئے۔ مجھے اس کارنامے پر انعام دیا گیا۔ ہم دونوں اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ تمہاری عمر اس وقت تقریباً ڈیڑھ سال کی تھی۔

اس رات چند دہشت گرد ہمارے گھر میں گھس آئے۔ وہ ہمیں مارنے ہی والے تھے کہ انہیں موبائل پر اطلاع ملی کہ پولیس وہاں پہنچنے والی ہے اور وہ فوراً اس گھر سے فرار ہو جائیں۔ تین چار دہشت گرد تو باہر نکل گئے لیکن آخر میں نکلنے والا دہشت گرد اچانک مُڑا اور میری طرف گولی داغ دی۔ تمہاری ماں اچانک میرے سامنے آ گئی۔ اسے سینے میں گولی لگی اور وہ فوراً ہی شہید ہو گئی۔ جاتے جاتے وہ مجرم اپنا پستول بھی وہیں پھینک گیا۔ میں نے گھبراہٹ میں وہ پستول اُٹھا لیا۔ اسی وقت پولیس پہنچ گئی۔ تمہاری ماں کی لاش گھر میں پڑی تھی۔ پستول پر میری انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ گولی مارنے والے نے تو دستانے پہنے ہوئے تھے۔ مجھے تمہاری ماں کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ عدالت نے مجھے وکیل فراہم کیا۔ مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میں صدمے کے زیرِ اثر سکتے میں تھا۔ میرا وکیل، نیا وکیل تھا۔ وہ ہر حال میں اپنا مقدمہ جیتنا چاہتا تھا اور میرا مقدمہ کمزور تھا۔ اس نے مجھے بچانے کے لیے تمہاری ماں پر الزام لگا دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تمہاری ماں ایک ایسے گروہ سے ملی ہوئی تھی جو لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ وہ بظاہر گھر میں مدد کے طور پر لڑکیوں کو سلائی کڑھائی کا کام سکھاتی تھی مگر اصل میں یہ کام کرتی تھی۔ اس کے مؤکل یعنی میں نے غیرت کے جوش میں اسے قتل کر دیا۔ یعنی میں نے ارادتاً یہ جرم نہیں کیا تھا، اس لیے مجھے موت کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔ ہم اس محلے میں نئے نئے آئے تھے۔ لوگ ہمیں زیادہ نہیں جانتے تھے، لہٰذا کسی نے بھی ہمارے حق میں گواہی نہیں دی۔

میرا وکیل میرے لیے کچھ بھی نہ کر سکا اور اس نے نجمہ کو خواہ مخواہ بدنام کر دیا۔ وہ بے چاری کون سی زندہ تھی کہ اپنی صفائی پیش کرتی۔ اس کے بعد ولی محمد نے اپنی کہانی سنائی تو وہ دونوں تڑپ تڑپ کر رو دیئے کہ ان کے معصوم بیٹے نے ساری عمر ایک جھوٹے قصے کی وجہ سے اتنی اذیت میں اتنی تنہا زندگی گزاری تھی۔ ''ولی محمد! تم میری اور اپنے بابا کی طرف سے نوراں کا شکریہ ادا کر دینا۔ ہم اسے اس کی نیکی کا بدلہ تو نہیں دے سکتے لیکن اس کا اجر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضرور ملے گا۔'' ولی محمد کی ماں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور بیٹے کو ایک بار پھر اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اب ولی محمد کو واپس اپنی دُنیا میں جانا تھا۔ اس کا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اپنی جنت کو چھوڑ کر پھر اس نفرت بھری دُنیا میں جائے مگر جانا تو بہر حال تھا۔ چلتے چلتے ولی محمد نے اپنے باپ سے کہا۔ ''بابا! مجھے تو آپ دونوں کی بے گناہی کا ثبوت مل گیا ہے، مگر میں دُنیا کو یہ حقیقت کیسے بتاؤں گا اور بغیر ثبوت کے میری بات کا کون یقین کرے گا؟'' ولی محمد کے باپ نے اسے ایک اخبار دیا۔ ''اس اخبار میں ایک نیک دل مگر غیر معروف صحافی نے اپنی رپورٹ چھپوائی تھی۔ وہ مجھے جیل میں آ کر ملا تھا مگر جب تک وہ رپورٹ چھپی، بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ایک غریب اور بے وسیلہ شخص تھا۔ وہ بس میرے لیے اتنا ہی کر

سکا۔ جس اخبار میں وہ رپورٹ چھپوا سکا، وہ بھی اس وقت ایک نیا اخبار تھا۔ شاید اب وہ اتنا غیر مستند نہ ہو، تم یہ اخبار لے جاؤ اور سب کو اصلیت سے آگاہ کرو۔ مجھے اللہ کی ذات پر پورا بھروسا ہے۔ حقیقت جاننے پر کوئی تم سے نفرت نہیں کرے گا اور میرا بیٹا ایک کام یاب انسان بنے گا۔" اسی پل ولی محمد کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ابھی تک ماں باپ کے ہاتھوں کا لمس تھا۔ ماتھے پر ماں کے پیار کی گرمی باقی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں ہے اور اس سے پہلے کہاں تھا۔ آہستہ آہستہ اسے سب کچھ یاد آگیا۔ شاید اس نے خواب دیکھا تھا اور خواب میں ہی ماں باپ سے ملا تھا۔ خواب یاد کر کے اس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا دل سنبھلا تو اس کے دل نے شدت سے چاہا، کاش! اس کے پاس اپنے والدین کی بے گناہی کا ثبوت ہوتا تو وہ ساری دُنیا کو بتاتا کہ اس کے بابا اور امی مجرم نہیں تھے۔ اس کی ماں ایک پاک باز عورت تھی اور اس کا باپ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ایک بہادر سپاہی تھا۔ وہ دونوں تو فرشتوں کی طرح نیک اور راست باز تھے اور دُنیا نے انہیں کیا بنا دیا تھا۔ اسی وقت ولی محمد کی نظر کونے میں پڑی ہوئی ایک چوکی پر پڑی، اس پر ایک اخبار پڑا تھا۔ ولی محمد کو بے حد حیرانی ہوئی۔ وہ تو کبھی اخبار نہیں خریدتا تھا۔ بس لائبریری جا کر پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس نے اخبار اُٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس میں نہ صرف ولی محمد کے والدین کے بارے میں حقیقت بیان کی گئی تھی بلکہ ان کی ایک ایک تصویر بھی تھی۔

ان دونوں کی ایک تصویر نہ جانے کیسے ولی محمد کے باپ کی جیب میں رہ گئی تھی اور اتفاقاً پولیس کے ہاتھ بھی نہیں لگی تھی۔ ولی محمد کو لگا کہ وہ اخبار نہیں، اس کے لیے قدرت کا ایک بہت بڑا انعام ہے۔ بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد آخر کار وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہوگیا۔ وہ اخبار اب ایک معمولی اخبار نہیں بلکہ بہت مشہور و معروف اخبار بن چکا تھا جس کی ہر بات مستند مانی جاتی تھی۔ اس اخبار کے علاوہ دوسرے اخباروں نے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ یہ حیرت انگیز حقیقت چھاپی تھی۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو میڈیا نے بھی بار بار یہ کہانی دہرائی تھی۔ رسالوں میں اس کی کہانیاں چھپی تھیں۔ ایک ٹی وی چینل نے تو اس پر ایک ڈرامہ بنا ڈالا تھا اور ولی محمد کو پیش کش کی تھی کہ اپنا کردار خود ادا کرے۔

اب ولی محمد کے اپنے محلے کے ہی نہیں، سارے شہر کی لوگ اس کی عزت کرتے ہیں بلکہ پورا ملک اسے جانتا ہے کہ وہ ان والدین کی اولاد ہے جنہوں نے معاشرے کی بھلائی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ وہ ولی محمد کے لیے ہی نہیں، سارے ملک کے لیے قابلِ فخر تھے۔

آج ولی محمد ایک باعزت اور پُروقار زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ایک بڑے محکمے میں بڑے عہدے پر فائز ہے۔ اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی ایک کام یاب زندگی کے لیے تمنا کی جا سکتی ہے۔ اس نے ماسی نوراں کو اکیلا نہیں چھوڑا۔ وہ آج بھی اس کے ساتھ ہے اور ولی محمد اس کو سگے بیٹے کی سی محبت اور عزت دیتا ہے۔ اس کی دن رات خدمت کرتا ہے۔ وہ لوگ جو ماسی نوراں کو حقیر سمجھتے تھے آج اس کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔

ولی محمد کے لیے وہ اخبار آج بھی ایک معمہ ہے۔ اس نے اسے بہت عقیدت کے ساتھ سنبھال کے رکھا ہے۔ وہ اکثر یہ سوچ کر حیران ہوتا ہے کہ کیا اس نے خواب دیکھا تھا یا واقعی ٹائم مشین کے ذریعے ماضی میں پہنچ گیا تھا۔ اپنے ماں باپ سے ملا تھا اور اس نے اسے وہ اخبار دیا تھا جس میں ان دونوں کی بے گناہی کا ثبوت تھا۔ اس کا یقین اور پختہ ہوگیا ہے کہ اللہ پاک اپنے مظلوم بندوں کی ضرور مدد کرتا ہے اور معجزے آج بھی رونما ہوتے ہیں۔ ☆☆☆

کھل اُٹھا رنگ چمن پھولوں کو رعنائی ملی
لطف آیا ڈوبنے کا جتنی گہرائی ملی

(محمد حنفاء مغل، واہ کینٹ)

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

(محمد اسامہ ورک، راولپنڈی)

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہے

(سدرہ منیر، لاہور)

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے اللہ کا رسولؐ بس

(صبیح الحسن، سیال کوٹ)

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

(علی عیش، گڑھا موڑ)

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

(ثمن رؤف، لاہور)

مقامِ نور سے آتا ہے ہر کرن کا جواب
دلوں سے جب کوئی پیش سوال ہوتا ہے
وہ انتہائے کرم سے نواز دیتا ہے
مجھے جب اپنی خطاؤں پہ ملال ہوتا ہے

(اسامہ احمد، گجرات)

خلوصِ دل سے ملوں تو سزا دیتے ہیں لوگ
سچے جذبات کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں لوگ
زندہ رہے تو بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے
مر جائے تو کندھوں پہ اٹھا لیتے ہیں لوگ

(محمد عبداللہ ثاقب میر، پشاور)

سپیروں نے بند کیا سانپوں کو یہ کہہ کر
انسان ہی کافی ہے انسان کو ڈسنے کے لیے

☆

اس سے بہتر تھا، اندھیروں میں بھٹکتے رہنا
میں تو شرمندہ ہوں اس دور کا انسان ہو کر

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

(علی ظفر، شیخوپورہ)

اپنے کردار کو رکھ مثلِ شجر بنا کر
کوئی پتھر مارے تو اسے ثمر عطا کر

☆

چلتا رہا جو آبلہ پائی کے باوجود
منزل کا مستحق وہی صحرا نورد ہے

(حیدر علی عامر حجازی، لاہور)

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

اس دور کی دنیا سے گزر کیوں نہیں جاتے
یہ لوگ بھی کیا لوگ ہیں مر کیوں نہیں جاتے
آنسو بھی ہیں آنکھوں میں دعائیں بھی ہیں لب پر
بگڑے ہوئے حالات سنور کیوں نہیں جاتے

(احور کامران، لاہور)

محمد عامر اقبال

ڈر

''انور کو ٹیم میں شامل کرنا ایسے ہی ہو گا، جیسے ٹیم کو ہرانا۔'' اکبر نے ہنستے ہوئے کہا اور پوری ٹیم زور زور سے ہنسنے لگی۔

''ہاں یار، تم لوگ ٹھیک کہہ رہے ہو، وہ بہت ڈر پوک ہے اور اتنا وہم کرتا ہے کہ وہ خود ہی آؤٹ ہو جاتا ہے۔'' علی نے اکبر کی بات کی تائید کی۔ انور دُور کھڑا چپ چاپ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا کہ اچانک ہی اسے کچھ خیال آیا اور وہ دوڑ پڑا۔ ☆☆

''انور کھانا کھا لو بیٹا! کہاں ہو؟ دیکھو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' انور کی امی نے کچن میں سے آواز لگائی۔

''ابھی نہیں، کل میرا ٹیسٹ ہے اور میری بالکل بھی تیاری نہیں۔'' انور نے کمرے سے ہی جواب دیا اور پھر پڑھنے لگ گیا۔

''یار کل ٹیسٹ پاس ہونا بہت مشکل ہے اور اوپر سے کیمسٹری کے ٹیچر کی مار اور کلاس میں لڑکوں کی باتیں......'' انور خود سے بات کرتے ہوئے بولا۔

''پتا نہیں کیمسٹری کس نے بنائی۔ بالکل سمجھ نہیں آتی۔ کل تو میری خیر نہیں، اللہ کرے کل سر ہی نہ آئیں۔'' وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

اتنے میں اچانک بجلی چلی گئی اور کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ وہ کتاب ہاتھ میں لے کر کیمسٹری کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور سوچتے سوچتے کب اس کی آنکھ لگی، اسے پتا ہی نہ چلا۔ ☆☆

آنکھ کھلتے ہی انور کی نظر گھڑی پر پڑی اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ ''آج پھر لیٹ ہو جاؤں گا۔'' وہ بڑبڑایا اور جلدی سے اُٹھ کر تیار ہونے لگ گیا۔ ناشتا کرتے وقت انور کی نظر اپنے ناخنوں پر پڑی اور اس نے جلدی سے ناخن کٹر اُٹھا لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو انور تم؟ ناشتا کرتے کرتے تم یہ ناخن کیوں کاٹنے بیٹھ گئے؟''

''آج پیر ہے اور اسمبلی میں آج تمام بچوں کے ناخن چیک کیے جائیں گے اور میرے تو بال بھی بڑھ گئے ہیں۔'' انور گھبرا کر بولا۔

''کچھ دن پہلے ہی تو تم نے کٹنگ کرائی تھی۔'' انور کی امی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں ناں! آپ کو نہیں پتا۔ بال ذرا سے بھی بڑے ہو جائیں تو سزا ملتی ہے۔'' انور نے بالکل رونے والی آواز میں جواب دیا۔ اس نے جلدی جلدی بالوں میں تیل لگایا، ناشتا ختم کیا اور پھر

جب اس نے گھڑی دیکھی تو اسکول کا گیٹ بند ہونے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ وہ جلدی سے بیگ اٹھا کر بھاگ پڑا۔

راستے میں انور بار بار آیت الکرسی پڑھتے ہوئے جا رہا تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ یااللہ آج ٹائم پر پہنچ جاؤں اور کیمسٹری کا ٹیسٹ بھی نہ ہو۔ وہ جیسے ہی گیٹ کے پاس پہنچا، چوکیدار نے آواز لگائی۔ ''جلدی کرو اور وقت پر آیا کرو۔''

انور جلدی سے بھاگ کر گیٹ میں داخل ہوگیا۔ ☆☆

اسمبلی میں قومی ترانہ بج رہا تھا اور انور اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ اسے ابھی بھی ڈر تھا کہ وہ اسمبلی میں پکڑا نہ جائے اور اسے مار نہ پڑ جائے۔ اللہ اللہ کر کے اسمبلی ختم ہوئی اور انور کلاس کی طرف چل پڑا۔

وہ مطمئن تھا کہ جس بات کا اسے ڈر تھا، وہ نہیں ہوئی۔ ☆☆☆

انور اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ساتھ بیٹھے اس کے دوست نعمان نے کہا۔ ''یار کیمسٹری کا ٹیسٹ تیار کیا؟''

نعمان کی بات سن کر انور کی گھبراہٹ پھر سے شروع ہوگئی اور وہ جلدی جلدی کتاب پڑھنے لگ گیا۔ اتنے میں کیمسٹری کے سر کلاس میں داخل ہوئے اور کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ انور کے دل کی دھڑکن اور بھی تیز ہو چکی تھی۔

''جلدی سے سب جوابی کاپیاں نکال لیں۔ میں سوالات بورڈ پر لکھ رہا ہوں۔ آپ لوگ اس کے جوابات لکھنا شروع کریں اور خبردار جو کسی نے کتاب کھولی، اور جو اس ٹیسٹ میں فیل ہوا اس کی خیر نہیں۔'' کیمسٹری کے ٹیچر کے یہ الفاظ انور کو ایسے لگ رہے تھے کہ جیسے اس کے دماغ میں کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہو۔

اس نے گھبراتے ہوئے جوابی کاپی نکالی اور لکھنے بیٹھ گیا۔

پہلا سوال لکھتے لکھتے انور کو ایسے لگا کہ اس کو جواب بھولنا شروع ہو گیا ہے۔ اس نے گھبراہٹ میں دوسرا سوال شروع کر دیا۔ آدھا جواب لکھ کے اسے پھر ایسا محسوس ہوا کہ اسے باقی جواب بھول گیا ہے۔ وہ پوری طرح گھبرا چکا تھا اور اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ٹیسٹ کیسے مکمل کرے۔ اتنے میں پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور سب بچوں نے اپنے اپنے جوابات جمع کرا دیئے۔ ☆☆

''انور آؤ ناں یار کھیلتے ہیں۔ اب کیوں پریشان بیٹھے ہو۔ تفریح میں تو انجوائے کیا کرو۔'' نعمان نے انور سے کہا۔

''نہیں یار تم کھیلو، مجھے نہیں کھیلنا۔'' انور نے اکتاہٹ سے جواب دیا۔

''ٹیسٹ جیسا ہونا تھا ہو گیا، اب پریشان ہونے کا کیا فائدہ!'' نعمان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''بات یہ نہیں ہے، گراؤنڈ میں دیکھو، کتنے لڑکے کھیل رہے ہیں اور کتنا رش ہے۔ دھکا لگ گیا یا گیند لگ گئی تو کیا ہوگا؟'' انور نے جلدی سے جواب دیا۔

''تمہارا کوئی حال نہیں، اتنا کیوں ڈرتے ہو؟'' نعمان مسکراتے ہوئے بولا اور چلا گیا۔ ☆☆

آج کا پورا دن اچھا نہیں گزرا تھا۔ ٹھیک سے ناشتا کیا، نہ ہی ٹیسٹ ٹھیک ہوا۔ اوپر سے آخری پیریڈ میں بلاوجہ مار پڑ گئی حالاں کہ میں شور بھی نہیں کر رہا تھا۔ اب کل پتا نہیں کیا ہوگا۔ انور خود سے ہی باتیں کرتے ہوئے گھر جا رہا تھا۔ وہ تھکا ہارا گھر پہنچا اور کھانا کھا کر سو گیا۔ ☆☆

شام کا وقت تھا اور سب بچے گراؤنڈ میں کھیل رہے تھے اور انور گراؤنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر انہیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک ہی اس کے کانوں سے آواز ٹکرائی۔

''کیا ہوا دوست، تم کیوں نہیں کھیل رہے؟''

انور نے مڑ کے دیکھا تو ایک لڑکا صاف ستھرے لباس میں اس کے پیچھے ہاتھ میں بلا لیے کھڑا تھا۔

''نہیں یار، بس میرا دل نہیں چاہتا۔'' انور نے جواب دیا۔ وہ لڑکا بھی پاس بیٹھ گیا۔

''کیوں دل نہیں چاہتا'' دیکھو کتنا زبردست موسم ہے اور سب کھیل رہے ہیں۔ میرا نام محمود ہے۔ ہم کل ہی سفید گیٹ والے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ ہم پہلے کراچی رہتے تھے۔ وہاں میرے بہت سے دوست تھے۔ ہم روز کرکٹ کھیلتے تھے۔ یہاں تو ہم کسی کو جانتے ہی نہیں۔ کیا تم میرے دوست بنو گے؟'' محمود نے ایک ہی سانس میں بنا پوچھے ہی ساری تفصیل بتا دی۔

''میرا نام انور ہے اور میں تمہارے ساتھ والے گھر میں رہتا ہوں۔'' انور نے ہاتھ ملایا اور مسکرا کے جواب دیا۔

''اوہ زبردست......! یعنی کہ ہم پڑوسی ہیں اور آج سے دوست بھی۔'' محمود نے ہاتھ ملاتے ہوئے پُرجوش انداز میں کہا۔

''ہاں! کیوں نہیں، آج سے ہم دوست ہیں۔'' انور نے بھی

مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا یہاں کوئی دوست نہیں؟'' محمود نے تجسس سے پوچھا۔

''دوست تو ہیں مگر میں کھیلتا نہیں۔'' انور نے جواب دیا۔

''وہ کیوں؟'' محمود کا تجسس اور بھی بڑھا۔

''یار پتا نہیں کیوں مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ اسکول سے ڈر، ٹیسٹ سے ڈر، اپنے ٹیچر سے ڈر، کھیلنے سے ڈر اور پتا نہیں کیوں ایک عجیب سا وہم ہو جاتا ہے کہ میں فیل ہو جاؤں گا یا کچھ بھی کروں تو وہ غلط ہو جائے گا۔ تمہیں عجیب تو لگے گا، لیکن ایسا ہے۔'' انور نے جواب دیا۔

''اوہ! تم کہہ رہے ہو تو ایسا ہوتا ہوگا، مجھے تم پر یقین ہے کیوں کہ اب ہم دوست ہیں۔'' محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆

محمود کے آنے کے بعد سے انور کو اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ایک اچھا دوست مل چکا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کرکٹ کھیلتے، ایک ساتھ پڑھتے اور محمود نے انور کے اسکول میں ہی داخلہ لے لیا۔ اب وہ کلاس فیلو بھی تھے۔ ☆☆

ایک دن وہ اکٹھے بیٹھے کیمسٹری کے ٹیسٹ کی تیاری کر رہے تھے کہ انور بولا۔ ''یار یہ کیمسٹری مجھے بالکل سمجھ نہیں آتی۔''

''وہ کیوں؟'' محمود نے پوچھا۔

''پتا نہیں یار، جب بھی میں ٹیسٹ دینے لگتا ہوں، مجھ سے گھبراہٹ میں غلط ہو جاتا ہے۔'' انور نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ مسئلہ کیمسٹری کا نہیں بلکہ ڈر کا ہے۔'' محمود نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ایسا ہی سمجھو!''

''تمہیں معلوم ہے کہ ڈر کسے کہتے ہیں اور یہ کیوں محسوس ہوتا ہے؟'' محمود نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے کبھی اس پر سوچا ہے۔'' انور نے کتاب بند کر کے محمود کو سننا شروع کر دیا۔

''یہ بات مجھے ایک ٹیچر نے بتائی تھی۔ ڈر ایک احساس ہے، یہ اصل میں کچھ نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمارے سوچے جانے والے خیالات سے محسوس ہوتا ہے اور یہ تب محسوس ہوتا ہے جب ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ آگے کیا ہوگا اور کسی بھی کام کی تیاری نہ ہونے کے احساس سے ڈر پیدا ہوتا ہے۔'' محمود نے سمجھایا۔

''کیا تم مجھے تفصیلاً سمجھا سکتے ہو؟'' انور نے اب دل چسپی لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا میں تمہیں آسان الفاظ میں سمجھاتا ہوں۔ مثال کے طور پر تمہیں ٹیسٹ سے ڈر لگتا ہے۔ تمہارے ڈر کی وجہ یہ ہے کہ تم سوچتے ہو کہ نہ جانے آگے کیا ہوگا؟ ٹیسٹ میں کیا آئے گا؟ تمہیں آتا ہو گا یا نہیں؟ تم فیل نہ ہو جاؤ؟ فیل ہوئے تو کیا ہوگا؟''

''ہاں! بالکل ایسا ہی ہے۔'' انور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ سب کیا تھے؟'' محمود نے پوچھا۔

''میرے اپنے خیالات۔'' انور نے جواب دیا۔

''یعنی تمہیں معلوم نہیں ہوتا کہ آگے کیا ہوگا جس کی وجہ سے تم اپنے دماغ میں خود سے ہی تصور کرتے ہو کہ ایسا ہوگا اور وہ تمہارے اپنے خیالات ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے تمہیں لگتا ہے کہ تمہاری تیاری ٹھیک نہیں اور تمہیں فیل ہونے کا ڈر محسوس ہونے لگ جاتا ہے۔'' محمود نے بتایا۔

''ہاں! بالکل ایسا ہے۔'' انور نے محمود کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہمیں کبھی بھی یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ آگے کیا ہوگا۔ وہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہمارے ہاتھ میں صرف تیاری کرنا اور کام کرنا ہے لیکن جب ہم خود سے سوچنے لگ جائیں کہ آگے کیا ہوگا اور اس کے جوابات خود سے ہی دینے لگ جائیں تو پھر ڈر پیدا ہوتا ہے۔'' محمود نے سمجھایا۔

''تو پھر مجھے کھیلنے سے ڈر کیوں لگتا ہے؟'' انور نے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ تم سوچتے ہو کہ تم گر جاؤ گے یا تم سے کھیلا نہیں جائے گا جس کی وجہ سے تمہارے ذہن میں ڈر بیٹھ جاتا ہے اور تم کھیل نہیں پاتے۔'' محمود نے جواب دیا۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' انور نے پوچھا۔

''آج کے بعد اگر تمہیں ڈر محسوس ہو تو تین باتیں یاد رکھنا۔

1- تم کبھی بھی مستقبل نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہی تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم اسے پہلے سے بدل دو۔

2- وہ تصویر جو تم اپنے دماغ میں بنا رہے ہو وہ اچھی ہے یا بُری؟ اگر تم اچھا سوچ رہے ہو گے تو تمہارا اعتماد خود پر بڑھے گا اور تم اچھے طریقے سے تیاری کر پاؤ گے اور اگر تم بُرا سوچ رہے ہوئے تو ڈر پیدا ہوگا اور تم تیاری نہیں کر پاؤ گے۔

3- چونکہ تمہارے ہاتھ میں صرف تیاری کرنا اور کام کرنا ہے اور نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں ہے تو تم اپنا پورا دھیان تیاری پر دو، ہر کام ٹھیک طریقے سے انجام دو۔

انور کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس نے آگے بڑھ کر محمود کو گلے سے لگا لیا۔ اسے اب اپنے ڈر کا حل مل چکا تھا۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ☆☆

''انور جلدی اُٹھو دیر ہو رہی ہے۔ اسکول دیر سے پہنچو گے تو مار پڑے گی۔''

امی کی آواز کان میں پڑتے ہی انور اُٹھا اور اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو کر سوچا۔

''مار پڑے گی یا نہیں، اس کا مجھے نہیں پتا۔ میں آرام سے تیار ہوتا ہوں اور ناشتا کر کے اسکول جاتا ہوں۔ جو چیز میرے بس میں ہے میں وہ کرتا ہوں اور جو چیز میرے بس میں نہیں اس سے پریشان ہونے کا کیا فائدہ۔'' یہ سوچ کر انور اُٹھا، آرام سے تیار ہوا اور اسکول کی طرف چل پڑا۔ اس کے خیالات میں ایک عجیب سا سکون تھا اور اب اس کا ڈر اس سے کوسوں دُور تھا۔ ☆☆☆

28 مئی: یوم تکبیر...... 28 مئی پاکستان کی تاریخ کا اہم دن تھا اور پاکستان عالم اسلام کی پہلی ایٹمی قوت بن گیا جس پر جتنا فخر کیا جائے، کم ہے۔ بھارت نے 1974ء میں ایٹمی دھماکہ کیا جس کی وجہ سے وہ خطے کا چوہدری بن گیا اور ہر پاکستانی یہ محسوس کر رہا تھا کہ بھارت پاکستان کو ہڑپ کر جائے گا اور ہم اس کا کیسے مقابلہ کریں گے۔ 28 مئی اور 30 مئی 1998ء کے چھ ایٹمی دھماکوں سے پہلے برسوں نہیں، عشروں پر نگاہ دوڑائی جائے تو بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بھارت نے مئی 1974ء میں پہلا ایٹمی دھماکہ کر کے ایٹمی طاقت بننے کے بعد لائن آف کنٹرول پر مستقل جارحیت کا سلسلہ جاری رکھا جس میں پاکستان کے سول و فوجی سینکڑوں نہیں، ہزاروں کی تعداد میں شہید و زخمی ہوئے۔ یہ روز مرہ کا معمول بن گیا تھا۔ بھارت ایٹمی طاقت ہونے کے زعم میں شب و روز بلا جواز لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزیاں کرتا رہا۔ بھارت کا توپ خانہ آزاد کشمیر پر آگ برساتا رہا۔ ایل او سی کے ساتھ رہنے والے کشمیری گھر بار چھوڑ کر پاکستان کے شہروں میں منتقل ہوتے رہے۔ یورپی یونین اور بھارت نے پاکستان پر سفارتی یلغار مسلسل جاری رکھی۔ وہ پاکستان کو طفیلی ریاست بنانے کا خواہاں تھا مگر 11 اور 13 مئی 1998ء کے بھارت کے ایٹمی دھماکوں کے بعد بھارت نے پاکستان کی تذلیل کرنے کے لیے ایسے ایسے بیانات دیئے جس کے بعد پاکستانی قوم نے کہا کہ ذلت کی سو سالہ زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔

28 مئی 1998ء کو سہ پہر تین بج کر سولہ منٹ پر راس کوہ کے پہاڑی سلسلے میں پاکستان نے 25 سے 30 کلوٹن طاقت کے پانچ ایٹمی دھماکے کیے جب کہ 11 سے 13 مئی 1998ء کو پوکھران (راجستھان) میں بھارت نے جو ایٹمی دھماکے کیے انٹیلیجنٹل جوہری ماہرین کے مطابق وہ دس سے بارہ کلوٹن طاقت کے تھے۔ پاکستان نے چھٹا اور آخری دھماکہ 30 مئی 1998ء کو چاغی سے ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر خاران کے صحرا میں کر ڈالا اس دھماکے کی طاقت تقریباً پندرہ کلوٹن تھی۔ چاغی میں چوں کہ پانچ سرنگیں سات سال میں بنی تھیں، چھٹے دھماکے کی گنجائش نہ رہی تو چھٹا دھماکہ خاران کے ریگستان میں ڈیڑھ سو میٹر گہرائی میں کیا گیا۔ چھ ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان نے دُنیا کے نیوکلیئر کلب میں اپنے قدم مضبوطی سے گاڑ لیے۔ آج پاکستان کا وجود اللہ کے بعد صرف اور صرف ایٹمی کامیابیوں کا مرہون منت ہے۔ 28 مئی کو قوم اظہار تشکر کے طور پر یوم تکبیر مناتی ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام

قومِ عاد کی تباہی اور بربادی کے بعد جو لوگ بچ رہے، وہ حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ کے میدان میں آباد ہو گئے۔ شروع میں یہ قوم عاد ثانیہ کہلائی لیکن بعد میں اپنے کسی بزرگ کے نام پر اس قوم نے اپنا نام ثمود اختیار کیا۔ یہ قوم بھی پہلی بھٹکی ہوئی قوموں کی طرح بت پرست تھی اور جب ان کے فسق و فجور حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق قوم ثمود میں ہی سے حضرت صالح علیہ السلام کو نبوت کا شرف دے کر مبعوث کیا۔ قوم ثمود کی تباہ شدہ عمارات اب تک حجاز اور شام کی راہ میں عوام کے لیے عبرت کا سامان مہیا کر رہی ہیں۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب اسلامی فوج اس راہ سے گزری تو صحابہؓ نے ثمود کے کنوئیں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹیاں تیار کرنے لگے۔ نبی ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے آٹا پھینک دینے اور پانی گرا دینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔ نہ یہاں قیام کرو اور نہ یہاں کی کسی چیز سے فائدہ اٹھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤ۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر قوم ثمود کی طرف بھیجا تو انہوں نے اپنی قوم کو جمع کر کے بُرے کاموں سے بچنے اور خدا کی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ آپؑ نے اپنی قوم کو بار بار سمجھایا۔ خدا کے عذاب سے ڈرایا اور ان پر خدا کے فضل و کرم جتائے، لیکن ان پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اس عقل و دولت اور شان و شوکت پر ہرگز گھمنڈ اور غرور نہ کرو۔ ایسی چیزیں پل بھر میں فنا ہو جایا کرتی ہیں۔ بلاشبہ یہ سب کچھ تم پر اللہ ہی کا فضل و کرم ہے۔ تمہیں چاہیے کہ اس کا شکر ادا کرو اور اس کی عبادت کرو۔ قوم ثمود کو سب سے بڑا تعجب یہ تھا کہ ہم میں سے ہی ایک شخص کیسے نبی بن گیا۔ آخر سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ حضرت صالح علیہ السلام سے کہا جائے کہ تم کوئی ایسی نشانی دکھاؤ جس سے ہمیں یقین ہو جائے کہ تم واقعی خدا کے رسول ہو۔ حضرت صالح علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی اور اللہ کا یہ نشان ایک اونٹنی کی صورت میں نمودار ہوا۔ قرآن میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں، صرف ''خدا کی اونٹنی'' کہا گیا ہے، البتہ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اونٹنی ایک پتھر سے پیدا ہوئی اور تھوڑی ہی دیر بعد اس نے بچہ جنا کیوں کہ قوم ثمود کا یہی مطالبہ تھا۔ خداوند کریم کا اپنے رسول کے ذریعے یہ معجزہ بھی ان سرکشوں کو خدا کی طرف راغب نہ کر سکا۔ تاہم آپؑ نے اپنی قوم کو نصیحت کی کہ یہ اونٹنی خدا کی طرف سے تم پر حجت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نشان تم پر ظاہر ہو چکا ہے۔ اگر تم اپنی بھلائی چاہتے ہو تو اس اونٹنی کو ہرگز ہرگز نقصان نہ پہنچانا۔ یہ آزادی سے جہاں چاہے چرے۔ ہاں، ایک روز یہ اونٹنی چشمے پر سے پانی پیا کرے گی اور دوسرے دن تم اور تمہارے جانور۔ دیکھو اس میں فرق نہ آئے۔ کچھ دن تک اونٹنی کے حیرت انگیز واقعہ نے اس قوم کو حیران و پریشان رکھا اور وقتی طور پر اونٹنی سے کوئی معترض نہ ہوا لیکن آہستہ آہستہ جن بُرائیوں کے ماحول میں انہوں نے پرورش پائی تھی، وہ اُبھرنے لگا اور انہوں نے سازش کر کے اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا۔ جب حضرت صالح علیہ السلام کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپؑ کو بہت رنج ہوا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؑ نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا: بدبخت قوم! آخر تجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اب تم خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن میں تم کو ہلاک و برباد کرے گا۔'' تین دن کے بعد کڑک اور گرج کی ایک ہیبت ناک آواز پیدا ہوئی، جس نے ہر انسان کو جو جس حالت میں تھا، ہلاک کر دیا لیکن وہ لوگ جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے، اس عذاب الٰہی سے بچ گئے۔ جب قوم ثمود پر عذاب نازل ہو رہا تھا تو حضرت صالح علیہ السلام نے قرآن حکیم کے الفاظ میں اپنی قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: ''اے قوم! بلاشبہ میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچا دیا اور تم کو نصیحت کی لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو دوست ہی نہ رکھتے تھے۔'' قوم ثمود کی تباہی کے بعد جو لوگ بچ رہے، وہ فلسطین میں آ کر آباد ہو گئے۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی 2016ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی 2016ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

مئی کا موضوع ''گرمی آئی گرمی'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 مئی 2016ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

ٹ	ض	ر	ہ	ڑ	ت	ل	ا	د	ع
ظ	ش	ا	و	ک	س	ق	گ	ء	ب
ر	ک	و	ن	ع	م	ت	غ	ژ	گ
ن	ر	ل	گ	ن	ا	س	ن	ا	ح
ا	ے	ت	د	ژ	ت	ض	ش	ل	ی
ص	ف	ا	ق	ت	د	ا	ر	ن	ر
ق	ز	ن	ہ	غ	ظ	ٹ	ع	ی	ف
ن	ا	ب	چ	پ	ن	ز	ص	ل	ت
ب	ڑ	غ	ی	گ	ظ	ء	ب	ا	ن
ث	ش	ک	ر	ا	ب	م	ے	ق	خ

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

نعمت، تفریح، مبارک، اقتدار، عدالت، نقصان، بچپن، تلوار، انسان، قالین

میری زندگی کے مقاصد

سید امجد حسین ہمدانی، لاہور

میں بڑا ہو کر پولیس آفیسر بنوں گا اور معاشرے سے بُرائیوں کا خاتمہ کروں گا۔

محمد حسنین، لودھراں

میں عالم دین بن کر ساری دُنیا میں اسلام پھیلاؤں گا۔

عاقب، کراچی

میں بڑا ہو کر انجینئر بن کر ملک کی خدمت کروں گا۔

سبط رضا، لاہور

میں فوجی بن کر اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد سفیان، لودھراں

عالم دین بن کر ملک و قوم اور اسلام کی خدمت کروں گا۔

شرمین شفیق، لاہور

میں بڑی ہو کر اُستانی بنوں گی اور ملک کا نام روشن کروں گی۔

دعا گل سید، چارسدہ

میں اُستانی بن کر علم کی روشنی پھیلاؤں گی اور غریب بچوں کو مفت تعلیم دوں گی۔

احمر وحید، لاہور

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا والدین اور ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔

عثمان نصیر، کراچی

میں بڑا ہو کر فوج میں شامل ہو کر پاکستان کی حفاظت کروں گا۔

عبداللہ صدیقی، وہاڑی

میں سائنس دان بن کر نئی ایجادات کر کے ملک کا نام روشن کروں گا۔

آمنہ محمد سلیم، کراچی

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

حافظ محمد وقاص باجوہ، لاہور

پاک آرمی میں شمولیت اختیار کر کے آفیسر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد جواد حسن، راول پنڈی

میں بڑا ہو کر کرکٹر بنوں گا اور پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

ماجد اقبال، کراچی

میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بن کر بیماروں کا مفت علاج کروں گا اور والدین کا نام روشن کروں گا۔

میاں محمد حیدر، سیال کوٹ

میں بڑا ہو کر آرمی آفیسر بنوں گا اور ملک کو دہشت گردوں سے پاک کروں گا۔

ایمان لطیف، لاہور

میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور دُنیا میں انسانیت کی خدمت کروں گی۔

جواد احمد، کراچی

میں بڑا ہو کر خدمت خلق کروں گا اور لوگوں کی دعائیں لوں گا۔

شعیب شوکت، کراچی

میں عالم دین بن کر پاکستان میں دین اسلام پھیلاؤں گا۔

محمد عثمان شوکت، قصور

میری زندگی شمع کی مانند گزرے اور ختم ہو، نشان چھوڑ جائے مگر اُجالا کر جائے۔ ان شاء اللہ

غصہ

جس نے سیکھا رب سے ڈرنا — اس نے چھوڑا غصہ کرنا
غصہ مثلِ آگ ہے بچو — اک زہریلا ناگ ہے بچو
جس کو بھی غصہ آتا ہے — عقل و خرد کو کھا جاتا ہے
جو غصے کو پی جاتا ہے — اس کا میٹھا پھل پاتا ہے
آقاؐ کا فرمان ہے بچو — غصے میں نقصان ہے بچو
سب سے گھٹیا کام ہے غصہ — چھوٹے پن کا نام ہے غصہ
تم سب غصہ پینا سیکھو — عزت سے تم جینا سیکھو

(ریاض حسین قمر، منگلا ڈیم)

دُنیا

دُنیا میں کچھ ایسی ہیرا پھیری ہے
غم کے ماروں کی تعداد بہتیری ہے
کیسے کیسے لوگ بسے ہیں دُنیا میں
جن کے گھر میں خالی پڑی چنگیری ہے
کسی کے گھر میں سورج رات کو اُگتا ہے
کسی کے گھر میں چاندنی بھی اندھیری ہے
اللہ نے جو کچھ بھی بنایا پیار کے ساتھ
اسی نے جگ میں روشنی بکھیری ہے
عزت سے حلال کا رزق کمائے جو
نزہیؔ سمجھ لو یہ بھی ایک دلیری ہے

(کاوش: نازیہ نزہی، نوشہرہ کینٹ)

ادب

ادب سے ہی انسان انسان ہے — نہ سیکھے جو ادب وہ حیوان ہے
جہاں میں نہ ہو کیوں کر پیارا ادب — کہ ہے آدمیت کا زیور ادب
نہ ہو جس کو اچھے بُرے کی تمیز — نہ وہ گھر میں پیارا نہ باہر عزیز
بٹھاتے نہیں بے ادب کو قریب — یہ سچ بات ہے بے ادب بے نصیب

(علینہ احمد، راول پنڈی)

انمول موتی

☆ کسی کے ایمان کا اندازہ اس کے وعدے سے لگاؤ۔
☆ زندگی ایک ایسا نغمہ ہے جو دوبارہ فرمائش پر نہیں چل سکتا۔
☆ وہ انسان حقیقی خوشی حاصل کر سکتا ہے جو اپنی خواہشات پر قابو رکھے۔
☆ محنت وقت کو بڑھا دیتی ہے اور سستی وقت کو گھٹا دیتی ہے۔
☆ بے کاری تمام شرارتوں کی دایہ اور کل بربادیوں کی ماں ہے۔
☆ دانا اسی چیز سے دولت حاصل کرتا ہے جسے نادان لاپروائی سے نظرانداز کر دیتا ہے۔
☆ سچی محبت ایک نایاب شے ہے لیکن سچی دوستی اس سے بھی زیادہ نایاب ہے۔
☆ دن کی روشنی میں رزق حاصل کرو اور رات میں اسے تلاش کرو جو رزق دیتا ہے۔
☆ جب بھی نماز پڑھو تو بوڑھے لوگوں جیسے پڑھو (آرام و سکون سے پڑھو) اور جب دعا مانگو تو اللہ کے حضور بچوں کی طرح ضد کر کے سچے دل سے مانگو۔

(حرم عمر، راول پنڈی)

سنہری اقوال

☆ شک کا ایک سوراخ محبت کی کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔
☆ انسان کی سب سے بڑی خوب صورتی اس کی مسکراہٹ ہے۔
☆ انسان کا چہرہ بھی کتاب ہے، مگر شرط ہے کہ آپ کو پڑھنا آتا ہو۔
☆ دوستی گولے کی مانند ہے، جسے بنانا تو آسان، مگر برقرار رکھنا مشکل ہے۔
☆ انسان اپنی توہین تو معاف کر سکتا ہے لیکن بھول نہیں سکتا۔

(شیرونیہ ثناء، حیدرآباد)

ہیرے جواہرات

☆ جو دُنیا میں رب کی پسند کی زندگی گزارے گا اللہ اسے من پسند آخرت دے گا۔
☆ جس نے استطاعت کے باوجود سادگی کا لباس پہنا، اللہ اسے

قیامت کے دن جنت کے بہترین لباسوں میں لباس عطا فرمائے گا۔

☆ اُستاد کا ادب جس معاشرے سے اُٹھ جائے وہاں سے علم بھی اُٹھ جاتا ہے۔

☆ اللہ قیامت والے دن کسی پر خوف جمع نہیں کرے گا۔

☆ عورت کا بہترین ہتھیار صبر اور خاموشی ہے۔

☆ جو دُنیا میں اللہ سے بے خوف ہو کر زندگی گزارے گا، قیامت والے دن بہت خوف زدہ ہوگا۔

☆ جو دُنیا میں رب کے خوف سے زندگی گزارے گا، قیامت والے دن اللہ اسے بے خوف اور خوش اُٹھائے گا۔

(ناظرہ مقدس، شیخوپورہ)

شاعر اور پہلوان

یونان کے ایک مشہور شاعر سے ایک پہلوان اپنی شہ زوری کی تعریفیں کرنے لگا۔ آخر شاعر نے اس سے اُکتا کر پوچھا۔

''تم اپنے سے زیادہ طاقت ور کو پچھاڑتے ہو یا اپنے سے برابر کو یا اپنے سے کم تر کو پچھاڑتے ہو؟''

پہلوان نے سینہ تان کر جواب دیا۔ ''اپنے سے طاقت ور کو۔''

شاعر نے کہا۔ ''یہ غلط ہے کیوں کہ تم جسے پچھاڑ لو، وہ تم سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو سکتا۔''

پہلوان نے خفت سے کہا۔ ''اپنے سے برابر کو۔''

''یہ بھی غلط ہے۔'' شاعر نے کہا۔ ''اگر تمہارا حریف تمہارے برابر ہے تو تم اسے کبھی نہیں پچھاڑ سکتے۔''

پہلوان نے مجبور ہو کر کہا۔ ''اچھا! اپنے سے کم تر کو۔''

شاعر نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے، اپنے سے کم تر پر ہر شخص غالب آجاتا ہے۔''

(فائزہ بنت کیپٹن عبدالرزاق، خانیوال)

خطرناک غلطیاں

☆ اپنا راز کسی کو بتا کر پوشیدہ رکھنے کی درخواست کرنا۔

☆ گناہ اس نیت سے کرنا کہ چند مرتبہ کر کے چھوڑ دوں گا۔

☆ اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرنا اور کسی خدائی عطیے کا امیدوار ہونا۔

☆ انسان کے متعلق ظاہری شکل و صورت دیکھ کر رائے قائم کرنا۔

☆ اپنے والدین کی خدمت نہ کرنا اور اپنی اولاد سے خدمت کی توقع کرنا۔

☆ جو کام خود سے نہ ہو سکے سب کے لیے ناممکن سمجھنا۔

☆ بے کاری میں آئندہ کے لیے خیالی پلاؤ پکانا اور خوش ہونا۔

☆ دوسروں کے سہارے عیش کرنا اور پھر عزت کی اُمید کرنا۔

☆ کسی کا نقصان کر کے اپنے لیے فائدے کی سوچ رکھنا۔

(حافظ توصیف الرحمان، توحید آباد)

خوب صورتی کے بہترین راز

☆ ہاتھوں کی خوب صورتی کے لیے اپنے ہاتھوں سے صدقہ دیں۔

☆ آواز کی خوب صورتی کے لیے قرآنِ پاک کی تلاوت کریں۔

☆ آنکھوں کی خوب صورتی کے لیے اللہ کے خوف سے آنسو بہائیں۔

☆ چہرے کی خوب صورتی کے لیے وضو کی عادت ڈالیں۔

☆ دل کی خوب صورتی کے لیے اپنے دل میں اللہ کی یاد بسائیں۔

☆ دماغ کی خوب صورتی کے لیے اللہ کی بارگاہ میں سجدہ کریں۔

(مائزہ حنیف، بہاول پور)

کسی شخص نے ایک دانش ور سے پوچھا: ''غصہ کیا ہے؟''

اس دانش ور نے بہت خوب صورت جواب دیا: ''کسی اور کی غلطی کی سزا خود کو دینا۔''

(حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

ایک اہم نصیحت

کچھ چیزیں وزن میں اتنی ہلکی ہوتی ہیں کہ وہ پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہیں مثلاً کاغذ، لکڑی اور گھاس پھوس وغیرہ لیکن چٹانیں جو پانی کے ساتھ بہتی نہیں ہیں بلکہ وہ پانی کا رُخ موڑ دیتی ہیں۔ ہم مومن ہیں اس لیے ہم گھاس پھوس اور تنکے نہ بنیں بلکہ ہم چٹان بن جائیں اور بہتے ہوئے پانی کا رُخ پھیر دیں۔

(مریم عبدالسلام شیخ، نواب شاہ)

جنت میں گھر

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تین بندوں کا گھر جنت کے وسط میں بنائے گا۔

1- جو حق پر ہوتے ہوئے بھی اپنا حق چھوڑ دے۔

2- جو مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے۔

3- جس کا اخلاق بہتر ہو۔

(عنبر فاطمہ، ننکانہ صاحب)

☆☆☆

ارہر کی دال

ارہر (Arhar) کی دال کو پیجیئن پی (Pigeon Pea) کہا جاتا ہے۔ اس دال کا سائنسی نام "Cajanus Cajan" جب کہ
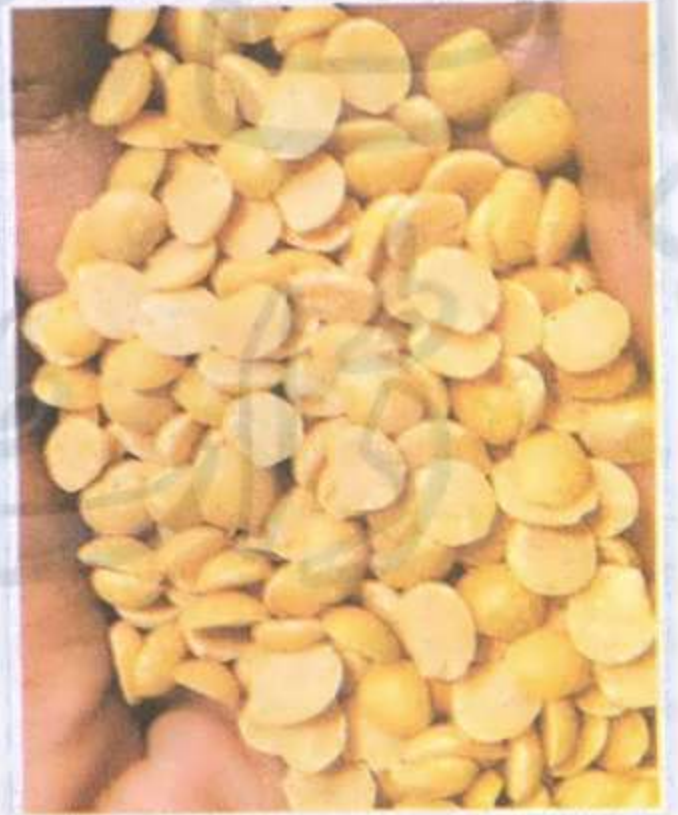
خاندان "Fabaleae" ہے۔ یہ سدا بہار پودا ہے۔ اس دال کی کاشت 3500 برس قبل بھارت میں شروع ہوئی۔ آج یہ دال بھارت، پاکستان، ایران، افغانستان، سری لنکا، نائجیریا، جنوبی افریقہ، گھانا، کینیا اور لاطینی امریکہ میں پکا کر کھائی جاتی ہے۔ یہ دال پروٹین کا خزانہ ہے۔ ایشیاء، یورپ اور امریکہ میں یہ پودا کاشت کیا جاتا ہے۔ یہ پھلی دار (Legume) پودا ہے۔ افریقی ممالک میں دال کو مرچ مصالحہ لگا کر بطور نمکو بھی کھایا جاتا ہے۔ یہ دال چاولوں کے ساتھ بھی شوق سے کھائی جاتی ہے۔ اس دال کو کھانے سے 20 قسم کے امائنو ایسڈز حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وٹامن بی، سی، ای اور وٹامن کے، کیلشیم آئرن، میگنیشیم، میگنیز، فاسفورس، پوٹاشیم، سوڈیم اور زنک بھی حاصل ہوتا ہے۔ کھیت میں اس پودے کو "Fusarium" اور "Phytophthora" نامی فنگس کے حملے کا خطرہ رہتا ہے۔ فارسی میں اس دال کو ''نخود کفتری'' کہتے ہیں۔

سرنگا پٹم

4 مئی 1799ء کو عظیم مسلمان حکمران ٹیپو سلطان (Tipu Sultan) کا یومِ شہادت ہے۔ آپ کافروں کے خلاف لڑتے ہوئے سرنگا پٹم کے مقام پر شہید ہوئے۔ اس مقام کو اب بھارتی علاقے کرناٹک میں شامل کیا گیا ہے۔ سرنگا پٹم ایک شہر ہے جو میسور شہر کے قریب ہے۔ ہندوؤں کے لیے یہ اس لیے اہم علاقہ ہے کہ یہاں ''رنگا ناتھ سوامی مندر'' ہے جہاں لاکھوں ہندو پجاری ہر

سال جمع ہو کر اپنے انداز میں عبادت کرتے ہیں۔ یہاں ایک مشہور دریا ہے جسے "Kaveri River" کہتے ہیں۔ اس شہر کا رقبہ 13 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے۔ یہ شہر سطح سمندر سے 679 میٹر بلند ہے۔ یہاں سے 27 کلومیٹر اوپر کی طرف ایک بہت بڑی آبشار ہے جو بھارت کی دوسری اور دُنیا کی سولہویں بڑی آبشار (Water fall)

ہے۔ ٹیپو سلطان اور آپ کے والد حیدر علی کے عہد میں اس مقام کو خصوصی حیثیت حاصل ہوئی۔ برطانوی انگریزوں نے مقامی شرپسندوں کے ساتھ مل کر ٹیپو سلطان سے اس مقام پر جنگ کی۔ یہ وہی مقام ہے جہاں ٹیپو سلطان نے مشہور زمانہ بات کی تھی کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ ٹیپو سلطان نے اس شہر میں 1784ء میں ''دریا دولت باغ'' بھی تعمیر کروایا۔ آپ کے والد اور والدہ فاطمہ فخر کا مزار بھی اسی شہر میں ہے۔

ڈوری مون

ڈوری مون (Doraemon) جاپانی لکھاری ٹیم کے رکن "Fujiko Fujio" کا تخلیق کردہ کردار ہے جس کی بہت سی فلمیں، کہانیاں اور تصوراتی قصے دُنیا بھر کے بچوں میں مقبول ہیں۔ ڈوری مون ایک مشینی بلی نما کردار ہے جس کے پاس متعدد آلات

ہیں جن کی مدد سے وہ ماضی، حال اور مستقبل میں چلا جاتا ہے۔ 1969ء میں یہ بچوں کے چھ مختلف رسائل میں متعارف ہوا۔ ابتداء میں نرسری سے کلاس چہارم کے بچوں کے لیے لکھا گیا۔ "Shogakukan" نامی ادارے نے اسے شائع کرنا شروع کیا۔ 2013ء سے اس سیریز کے انگلش ترجمے بھی مارکیٹ میں ملنے لگے۔ یہ مشینی بلی جس کردار کے پاس ہے اس کا نام "Nobita" ہے۔ چناں چہ ڈوری مون کی جیب میں موجود آلے Gadgets ''نوبی تا'' کی مدد کرتے ہیں اور اس کو خوش رکھتے ہیں۔ 2001ء سے ڈوری مون سیریز کی ویڈیو گیمز بھی دستیاب ہیں۔ ڈوری مون ایک دوست اور ہمدرد کردار ہے جو چوہوں سے ڈرتا ہے۔ اس کرداری سیریز کو 1982ء میں "Shogakukan Manga Award" اور 2008ء میں "Osamu Tezuka Culture" ایوارڈ بھی ملا۔ ڈوری مون کھانے میں ڈورا ایک بڑے شوق سے کھاتا ہے۔

ریڈ کراس ڈے

ہر سال 8 مئی کو ورلڈ ریڈ کراس ڈے (World Red Cross Day) منایا جاتا ہے۔ اس دن کو اس تنظیم کے بانی جین
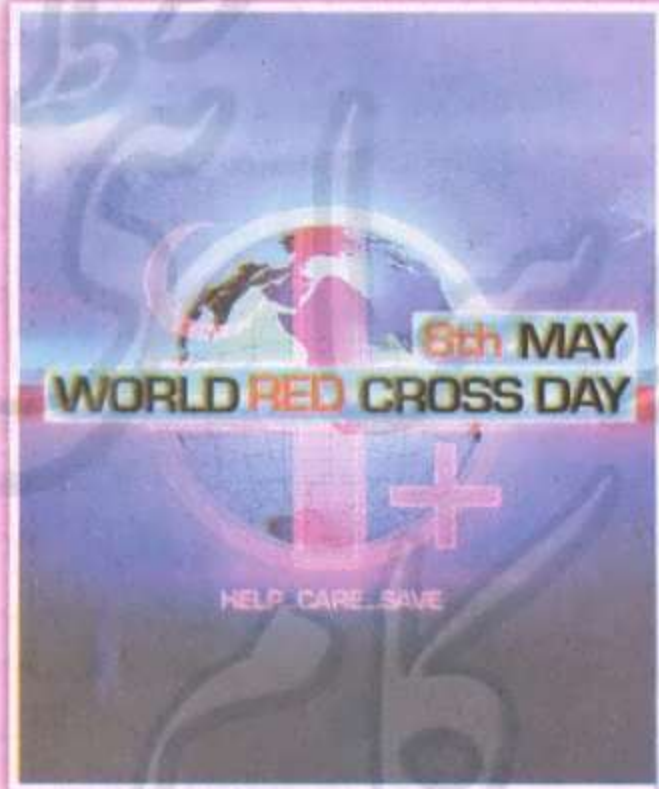
ہنری ڈونانٹ "Jean Henri Daunant" کی سال گرہ کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ آپ کا تعلق سوئٹزرلینڈ سے تھا۔ آپ 8 مئی 1828ء کو جنیوا سوئٹزرلینڈ میں پیدا ہوئے جب کہ 30 اکتوبر 1910ء کو وفات پائی۔ آپ کے والد کا نام "Jean Jacques Daunant" تھا۔ 1901ء میں آپ کو امن کا نوبل انعام بھی ملا۔ ریڈ کریسنٹ ڈے لوگوں کو متوجہ کرنے کا دن ہے۔ یہ تنظیم زمانہ امن اور جنگ میں بیمار، زخمی، لاچار لوگوں کی مدد کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ دُنیا بھر میں اس تنظیم کے ہزاروں دفاتر ہیں جہاں سے بیماریوں اور افلاس و حادثات کے خلاف جنگ لڑی جاتی ہے۔ بچوں، بڑوں، خواتین و حضرات کو خون کے عطیات فراہم کرنے کے حوالے سے بھی ریڈ کراس کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

ایک نیا شاعر ایک رسالے کے ایڈیٹر کے پاس غزل لے کر گیا۔
ایڈیٹر نے پوچھا: ''یہ غزل آپ کی ہے؟''
شاعر نے کہا۔ ''بے شک، کیا آپ اسے شائع کریں گے؟''
ایڈیٹر نے کہا: ''افسوس! یہ ہمارے رسالے کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔''
شاعر آہستہ سے بڑبڑانے لگا: ''یا اللہ خیر! غالب کی غزلیں بھی غیر معیاری ہونے لگی ہیں۔''

☆

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا: ''کیوں بھئی! تم نے گانے کی مشق کیوں چھوڑ دی؟''
دوست نے آہ بھر کر کہا: ''اپنے گلے کی وجہ سے۔''
اس شخص نے حیرت سے پوچھا: ''کیوں، کیا ہوا گلے کو؟''
دوست نے افسردہ ہو کر جواب دیا: ''کچھ نہیں، بس پڑوسیوں نے دبانے کی دھمکی دی ہے۔''
(محمد حیات، محمد رومان، پشاور)

ایک پاگل نے دوسرے پاگل کی جان بچائی۔
ڈاکٹر: ''تم نے اس پاگل کو پانی کے تالاب سے نکال کر یہ ثابت کر دیا کہ تم نارمل ہو، مگر افسوس اس نے آج صبح رسّی سے لٹک کر خودکشی کر دی۔''
پاگل: ''ہاہاہا، وہ تو میں نے سکھانے کے لیے لٹکایا تھا۔''
(حبیب الرحمٰن ملک، کراچی)

بھائی (اپنی بڑی بہن سے): ''آپی! چشموں کا پانی کدھر جاتا ہے؟''
بہن (غصے سے): ''میرے سر میں۔''
بھائی: ''اچھا! تبھی میں کہوں آپ کی ناک ہر وقت کیوں بہتی رہتی ہے۔''

☆

بہن (بھائی سے): ''کوئی اچھا شعر سناؤ۔''
بھائی: ''سنو!

جگر کا خون چوس لیتا ہے امتحان کا زمانہ
کبھی سہ ماہی، کبھی نوماہی، کبھی سالانہ''
(شاہ زیب علی، سرگودھا)

پٹھان (رکشے والے سے): ''اسٹیشن جانے کے کتنے پیسے لو گے؟''
رکشے والا: ''50 روپے۔''
پٹھان: ''20 لے لو۔''
رکشے والا: ''20 میں کون لے کر جائے گا۔''
پٹھان: ''تم پیچھے ہٹو، ہم لے کر جائے گا۔'' ☆

اُستاد (شاگرد سے): ''جس آدمی کو سنائی نہ دے اس کو انگلش میں کیا کہیں گے؟''
شاگرد: ''جو مرضی کہہ دو، اس کو کون سا سنائی دے گا۔''
(مائرہ حنیف، بہاول پور)

علی (اپنے دوست سے): ''یار رات ایک آدمی نے چاقو دکھا کر میرا موبائل چھین لیا۔''
دوست: ''لیکن تم تو ہمیشہ اپنے ساتھ چاقو رکھتے ہو۔''
علی: ''ہاں، لیکن وہ میں نے چھپا لیا تھا، ورنہ وہ بھی چھین لیتا۔''
(ابرار الحق، رجہ جنگ)

اُستاد (شاگردوں سے): ''اب آپ صفحہ نمبر 42 پر آجائیے۔''
ایک شاگرد: ''جناب رکشہ میں یا ٹیکسی میں؟'' ☆

ڈاکٹر (بچے سے): ''بیٹا! تم گھر سے کیا کھا کر آئے ہو؟''
بچہ: ''ابا جی کی جوتیاں......'' (حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

ایک شخص: ''تم روزانہ روٹی مانگتے ہو۔ آج زردہ اور پلاؤ کیوں مانگ رہے ہو؟''
فقیر: ''آج میری شادی کی سال گرہ ہے۔'' (ثروت یعقوب، لاہور)

ایک دوست (دوسرے دوست سے): ''ڈاکٹر پرچے پر ایسا کیا لکھتے ہیں جو صرف میڈیکل اسٹور والے ہی سمجھ پاتے ہیں؟''
دوسرا دوست: ''وہ لکھتے ہیں، میں نے لوٹ لیا ہے...... اب تم بھی لوٹ لو۔''
(محمد خان، موچھ)

مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''مجھے عجیب و غریب قسم کا مرض لاحق ہو گیا ہے، جب میری بیوی بولتی ہے تو مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔''
ڈاکٹر نے کہا۔ ''جناب! اسے بیماری نہیں، نعمت خداوندی کہیے۔''
(جواد اعجاز، بازہ ہملٹ)

بوجھو تو جانیں

1- جب کریں منہ اس کا کالا
کام بنائے سب سے اعلیٰ

2- بیٹھے بیٹھے تڑ تڑ بولا
بن کر اٹھا آگ بگولا

(ثمن فاطمہ، محمد علی، بھلوال)

3- چار ہیں بہنیں اور ایک بھائی
خوب ہیں ان میں صلح صفائی
بھائی اگر نہ ہاتھ بٹائے
ایک بھی کام نہ ہونے پائے

4- ہے وہ لال نگر کی رانی
مرتی ہے گر پی لے پانی

(ایمن اعجاز، صوابی)

5- ایسا بنگلہ تم کو دکھائیں
جس میں ایک جہان سمائے

(حیدر علی حجازی، لاہور)

6- نہ مٹی نہ ریت
ایسا ہے اک کھیت

7- چھوٹی سی اک نار
ڈبکی مارے جائے پار

8- جناب عالی، سر پر جالی
انتڑیاں بہت پیٹ خالی

9- پانی کا مٹکا پیڑ پر ہے لٹکا
ہوا کا جھونکا اس کو نہیں کھٹکا

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

اس تصویر میں دس بچے چھپے ہوئے ہیں۔ ذرا انہیں ڈھونڈیے تو.....

استرابری شیفون پائی

پائی بیس کے اجزاء: ڈائجسٹو بسکٹس: 8 اونس، مکھن: 4 اونس

فلنگ کے اجزاء: اسٹرابریز: 250 گرام، کاسٹر شوگر: 8 اونس، جیلٹین: 1 کھانے کا چمچ، انڈے کی سفیدی: 3 عدد، پھینٹی ہوئی کریم: 1 کپ

ترکیب: سب سے پہلے 8 اونس بسکٹس کو کرش کر کے اس میں پگھلے ہوئے 4 اونس مکھن کے ساتھ مکس کر لیں۔ پھر اس کی 8 انچ کے فلیٹ ٹن پر تہہ بچھا لیں۔ ایک پین میں 3 اونس چینی، 1 کھانے کا چمچ جیلٹین اور 250 گرام میں سے آدھی کٹی اسٹرابری ڈال کر 2 منٹ کے لیے اُبال آنے تک پکائیں اور نکال کر الگ رکھ دیں۔ اب ایک الگ پین میں باقی بچی اسٹرابری کو 2 اونس چینی کے ساتھ اُبال آنے تک پکا لیں۔ پھر ایک پیالے میں 3 عدد انڈے کی سفیدی کو اچھی طرح اسٹف ہونے تک پھینٹ لیں۔ اب اس میں 2 اونس چینی میں مکس کر کے اسے اسٹرابری اور جیلٹین پیوری میں فولڈ کر لیں۔ پھر 1 کپ پھینٹی ہوئی کریم میں بھی فولڈ کر لیں۔ پھر اس مکسچر کو بنائے ہوئے بسکٹس بیس پر ڈالیں اور اوپر سے اسٹرابریز ڈال دیں اور چھری کی مدد سے سیٹ کر کے 2 گھنٹوں کے لیے سیٹ ہونے تک ٹھنڈا کر لیں۔

فالودہ مشروب

اجزاء:

دودھ: 5 کپ، کنڈینسڈ ملک: 1/2 ٹن، مکس فروٹ: 1 کپ، اسٹرابری آئس کریم: 1 لیٹر، روح افزا: حسب ضرورت، اسٹرابری جیلی: ایک پیکٹ، پستہ، بادام کٹے ہوئے: حسب ضرورت، فالودہ سویاں: حسب ضرورت

ترکیب: سب سے پہلے دودھ اور کنڈینسڈ ملک کو مکس کر کے 4 گھنٹوں کے لیے ٹھنڈا کر لیں۔ پھر گلاس لیں اور اس میں پہلے روح افزا ڈالیں، پھر ٹھنڈا کیا ہوا دودھ، پھر سویاں، پھر آئس کریم کا سکوپ، پھر مکس فروٹ، پھر جیلی (پکا کر جما لیں) اور پھر سب سے اوپر پستہ بادام ڈال کر پیش کریں۔

چکن جلفریزی

اجزاء:

چکن اسٹرپس: 1/2 کلو، کٹی درمیانی پیاز: 2 عدد، شملہ مرچ اسٹرپس: 1 عدد، ادرک اسٹرپس: 2 کھانے کے چمچ
ہری مرچ اسٹرپس: 3 عدد، کٹا ہرا دھنیا: 1 کھانے کا چمچ، ٹماٹر کیوبز: 2 عدد، پسی لال مرچ: 1 کھانے کا چمچ
ہلدی: 1/4 کپ، کالی مرچ: 1/2 چائے کا چمچ، کیچپ: 1/4 کپ، سویا سوس: 1 کھانے کا چمچ
مسٹرڈ پاؤڈر: 1/2 چائے کا چمچ، ڈی پی سوس: 1 چائے کا چمچ، گرم مصالحہ: 1/4 چائے کا چمچ، نمک: 3/4 چائے کا چمچ
تیل: 1/4 کپ

ترکیب: ایک پین میں 1/4 کپ تیل گرم کر کے اس میں 2 عدد کٹی درمیانی پیاز ڈال کر 1 منٹ فرائی کریں۔ اب اس میں 2 کھانے کے چمچ ادرک جولین کٹنگ، 1/2 کلو چکن اسٹرپس شامل کر کے 5 منٹ کے لیے فرائی کر لیں۔ پھر اس میں 1 کھانے کا چمچ پسی لال مرچ، 1/4 چائے کا چمچ ہلدی، 1/2 چائے کا چمچ کالی مرچ، 1/2 چائے کا چمچ مسٹرڈ پاؤڈر، 3/4 چائے کا چمچ نمک، 1 کھانے کا چمچ سویا سوس، 1/4 کپ کیچپ، 1 چائے کا چمچ ڈی پی سوس، 1/2 کپ پانی، 2 عدد ٹماٹر کیوبز، 1 عدد شملہ مرچ اسٹرپس، 3 عدد ہری مرچ اسٹرپس اور 1 کھانے کا چمچ کٹا ہرا دھنیا ڈال دیں۔ آخر میں اسے نان کے ساتھ سرو کریں۔

پیارے بچو! آپ جانتے ہیں کہ انسانی زندگی کے لیے درخت اور پودے بہت ضروری ہیں کیوں کہ درخت اور پودے سورج کی روشنی میں ہمیں آکسیجن فراہم کرتے ہیں۔ درخت فضا میں آلودگی کو کم کرتے ہیں۔ پودے نہ ہوں تو فضا میں آلودگی بڑھ جاتی ہے۔ نتیجتاً موسم میں غیر متوقع تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ شدید گرمی پڑتی ہے اور سردی کا دورانیہ کم ہونے لگتا ہے، لہٰذا حکومت نے جنگلوں میں درخت کاٹنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ نذیر صاحب فاریسٹ آفیسر تھے۔ قریبی گاؤں جو ایک جنگل کی طرح تھا۔ وہاں ان کی ڈیوٹی تھی۔ انہیں ٹارگٹ دیا گیا تھا کہ وہ درختوں کی غیر قانونی کٹائی کی روک تھام کریں۔ اب وہ ان آدمیوں کی تلاش میں تھے جو جنگل میں درخت کاٹتے تھے۔ انہوں نے شک کی بنیاد پر دو آدمیوں کو پکڑا۔ ان میں سے ایک بوڑھا بابا کرم دین تھا اور دوسرا آدمی اسلم تھا۔ اسلم کے پاس جدید قسم کی آری تھی جس سے وہ درخت کاٹا کرتا تھا جب کہ بابا کرم دین کے پاس روایتی کلہاڑی تھی۔ فاریسٹ آفیسر نذیر صاحب نے دوران تفتیش دونوں آدمیوں سے پوچھ گچھ کی۔ اسلم نے کہا کہ بابا کرم دین نے درخت کاٹے ہیں۔ بابا کرم دین بار بار انکار کرتا کہ یہ جرم میں نے نہیں کیا۔ نذیر صاحب نے جائے واردات کو غور سے دیکھنے کے بعد اسلم کو مجرم قرار دے کر پولیس کے حوالے کر دیا۔

بچو! آپ سوچ کر بتائیے کہ انہوں نے کس طرح کھوج لگایا کہ اسلم مجرم ہے؟

پیارے بچو! اپریل 2016ء کے کھوج لگائیے کا جواب ہے: سوراخ میں پانی ڈالنے سے گیند اوپر آجائے گی۔

اپریل 2016ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- محمد شارق شفیق، لاہور
2- محمد عمار، واہ کینٹ
3- مومنہ مقصود، ٹوبہ ٹیک سنگھ
4- پاکیزہ جاوید ہاشمی، فیصل آباد
5- ایمن اظہر، لاہور

غصے میں وحشی بنا ہوا راجو گدھے کی پٹائی کر رہا تھا۔ مار کٹائی کرتے وقت وہ یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ گدھے کے کس حصے پر ڈنڈے کی بارش ہو رہی ہے۔ گدھا بے چارہ، قسمت کا مارا اس کی مار سے نپٹنے کے لیے دولتیاں جھاڑ رہا تھا۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ راجو اس کے نشانے میں آئے مگر ہر بار وہ اس کے وار سے بچ جاتا۔ منہ کھول کر اسے کاٹنے کو دوڑتا لیکن منہ کی کھاتا۔ اصل میں راجو کے ہاتھ میں جو ڈنڈا تھا، اس کی لمبائی زیادہ تھی اور گلے کی رسّی اگلی ٹانگوں سے بندھی ہوئی تھی۔

وہ گالیاں اور بددعائیں بک رہا تھا۔ مارتے ہوئے وہ گدھے کو جانوروں کے اسپتال کی طرف ہانک رہا تھا۔ راستے میں جیدو ملا۔ اس نے راجو کا ہاتھ روکا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس وجہ سے اس کا غصہ قہر بن کر گدھے پر برس رہا تھا۔

''یار راجو! کچھ تو اس بے زبان پر رحم کھاؤ۔ مار مار کر اس بے زبان کو زخمی کر دیا ہے۔ بس کرو اب! اتنی سزا ہی کافی ہے۔ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔ اگر کسی محکمہ انسدادِ بے رحمی کے ملازم نے دیکھ لیا تو تمہیں کانجی ہاؤس میں قید کر دیں گے جہاں کھانے کو گھاس پھونس دیں گے جو تم سے کھائی نہ جا سکے گی۔ تمہارے جسم پر بوجھ لاد کر دوڑائیں گے تو تم سے دوڑا نہ جا سکے گا۔ جب تک تجھے جانوروں کی تکلیف کا احساس نہ ہوگا، تب تک تمہاری رہائی کا چانس نہیں بنے گا۔ اگر انہوں نے چھوڑا بھی تو ٹھیک ٹھاک قسم کا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ راجو کوئی جواب دیتا۔ گدھے نے اپنی دونوں آنکھیں پوری کھول کر غصے سے راجو کے ہاتھ میں ڈنڈے کو زہریلی نظروں سے دیکھا اور موقع کی نزاکت سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اُچھل اُچھل کر دولتیاں جھاڑیں۔ راجو نے بڑی ہوشیاری سے اپنے آپ کو بچایا مگر اس نے دو فلائنگ کک جیدو کے پیٹ پر لگا دیں۔ جیدو نے غصے سے ایک پتھر دُور سے گدھے کے ماتھے کی طرف پھینکا جو اسے تو نہ لگا مگر اس کی ٹانگوں کی رسّی پر پڑا اور رسّی ٹوٹ گئی۔ گدھے نے بھاگ جانے میں ہی خیریت سمجھی۔ ادھر جیدو اپنے پیٹ کو پکڑے آسمان کی طرف منہ کر کے چیخ رہا تھا۔ راجو نے کہا۔ ''دیکھا ہمدردی کرنے کا نتیجہ، پہلے تم چت گرے اور اب آسمان کی طرف منہ کر کے گیدڑ کی طرح رو رہے ہو۔'' جیدو نے گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ اس دم راجو کو خیال آیا کہ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے، کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ اس نے جیدو کی پٹائی کی ہے اور مفت میں مارا نہ جائے۔ جیدو کو درد سے تڑپتا چھوڑ کر گدھے کے پیچھے بھاگا جو قریبی کھیتوں میں چر رہا تھا۔ اب وہ آزاد تھا۔ اس کو پکڑنا آسان نہ تھا۔ کئی بار وہ گدھے کے پاؤں سے بندھی ہوئی رسّی کو پکڑنے کی کوشش میں تیزی سے جھکا مگر پیٹ کے بل گرا۔ گدھے کو گھیرنے کی دوڑ دھوپ میں کئی بار وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھا جس سے نہ صرف کپڑے پھٹے بلکہ جھاڑیوں کی شاخوں اور کانٹوں نے اس کے جسم پر جیومیٹری کی کئی شکلیں بنا دیں۔ گدھا بھاگتے ہوئے خانہ بدوشوں کے خیموں میں جا گھسا جہاں کتوں کی ایک ٹیم نے اسے گھیر لیا اور بھونکنا شروع کر دیا۔ گدھا وہاں بے بس ہوگیا کیوں کہ کتوں نے اس کا پہیہ جام کر دیا تھا۔

راجو جب گدھے کو اسپتال لایا تو اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب اس گدھے کا پوسٹ مارٹم کر دو۔'' ڈاکٹر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بکھرے ہوئے بال اور پھٹی ہوئی پتنگ

جیسا لباس، جیسے اس نے گدھے کے ساتھ کشتی لڑی ہو یا کبڈی کھیلی ہو۔ ڈاکٹر نے کچھ جواب دیئے بغیر گدھے کے زخموں کو صاف کرنا شروع کر دیا۔ جیدو نے دوبارہ پوسٹ مارٹم کے لیے کہا تو ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''پوسٹ مارٹم مُردے کا کیا جاتا ہے جس کی موت غیر قانونی طور پر ہوئی۔ اس کو مار مار کر تم نے اس کی چمڑی کا تو قیمہ کر دیا ہے، ہم ڈاکٹر لوگوں کو صحت مند اور تندرست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گدھے کے سامنے گھاس کا ایک ڈھیر رکھ دیا تاکہ وہ کھانے میں مشغول رہے اور وہ اس کے زخموں پر دوائی لگا سکے۔

ادھر ڈاکٹر کے جواب پر راجو نے رونا شروع کر دیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب اس کو ایسی دوائی دو جس سے اس کے پیٹ کی ساری آنتیں باہر آ جائیں، مجھے اس سے غرض نہیں کہ زندہ رہے یا مر جائے؟'' گدھے نے گھاس کھاتے ہوئے غصے سے راجو کو سر اُٹھا کر دیکھا جیسے وہ دانت پیس کر کہہ رہا ہو۔ ''تم بچ گئے ہو۔ رسّی نے مجھے بے بس کیا ہوا تھا، ورنہ کرکٹ کے بال کی طرح چوکا یا چھکا کھا کر دُور گرتے۔''

ڈاکٹر صاحب نے گدھے کے زخموں پر دوائی لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اصل میں تم نے گدھے کی دولتی کھائی ہے یا اس کے اوپر سے گرے ہو۔ جب ہی تم اس بے ضرر، بے زبان گدھے کی جان کے دشمن ہو رہے ہو مگر میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہم بیماروں کو تندرست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

جب راجو نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب گدھے کے ہمدرد بنے ہوئے ہیں اور کسی صورت وہ اس کا پیٹ چاک کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو اس نے بحث شروع کر دی۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کس طرح اسے بے ضرر اور شریف جانور سمجھتے ہیں۔ یہ موٹی موٹی اس کی آنکھیں ہیں، مگر اندھی لگتی ہیں کیوں کہ نہ صرف سبز گھاس بلکہ ہر چیز کو کھا جاتا ہے۔ کل میری امی کا سبز دوپٹہ کھا گیا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس کی نسل ختم نہیں ہو رہی حالاں کہ دُنیا سے کئی جانوروں کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔ بھینس کے برابر اس کا دماغ ہے۔ یوم آزادی کا جشن منانے کے لیے میں نے گھر کو جھنڈیوں سے سجایا اور ایک بڑا جھنڈا چھت پر لگایا۔ ہوا کا جھونکا جب جھنڈیوں کو چھو کر گزرتا تو سرسری آواز سے ہمارے خون میں جوش پیدا ہوتا اور دل میں احساس اُبھرتا کہ ہم آزاد ہیں اور اپنے ملک کی خدمت اور حفاظت کریں گے۔ چھت پر لہراتے ہوئے جھنڈے کو دیکھ کر ہماری آنکھوں کی روشنی بڑھتی اور دل کو سکون ملتا۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرا جھنڈا مجھ سے کہہ رہا ہے کہ پاکستان کو مضبوط بناؤ۔ یہ ایک عظیم اسلامی ملک ہے۔ اسے بُرائیوں سے پاک صاف رکھنا۔''

ڈاکٹر نے راجو سے پوچھا۔ ''اللہ تمہیں اس ارادے پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، مگر اس گدھے کا یوم آزادی کے جشن سے کیا واسطہ؟''

راجو نے جواب دیا۔ ''دن کے بارہ بجے اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا شروع کر دیا۔ پہلے میں سمجھا کہ شاید اپنی زبان میں خوشی کا کوئی نغمہ گا رہا ہے مگر بار بار جھنڈے کی طرف دیکھتا تو میں نے اندازہ لگایا کہ جھنڈے پر منہ مارنے کو ترس رہا ہے جو کہ اس کی پہنچ سے دُور تھا۔ اسے اتنا معلوم نہیں کہ جو ہمارے جھنڈے کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے گا، ہم اس کی آنکھیں نکال دیں گے۔ اس کا اتنا بڑا سر ہے لیکن عقل سے خالی۔ میں نے صحن میں رکھی ہوئی کرسی پر اپنا بٹوہ رکھا جس پر بانس کی پتیوں کا خوب صورت ڈیزائن تھا۔ میں اندر سے لسٹ لینے گیا، یہ حویلی سے نہ جانے کس طرح چھوٹ کر چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر میں کیسے داخل ہوا۔ جب میں باہر نکلا تو بٹوہ غائب تھا اور کرسی کے قریب کھڑا یہ منہ ہلا رہا تھا۔ اس نے میرا خانہ خراب کر دیا۔ جی چاہتا ہے اس کو ابھی ذبح کر کے اس کا پوسٹ مارٹم کروا دوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بٹوہ اس کے سرنگ جیسے گلے سے گزر کر اس کے معدے میں امانت کے طور پر پڑا ہو گا۔ اس کا پیٹ کوئی دوزخ تو نہیں جس میں چمڑے کا بٹوہ اندر پہنچتے ہی جل سڑ گیا ہوگا۔

اس کے بڑے بڑے دانت ہیں، مضبوط اور موٹے۔ اس نے یقیناً میرے بٹوے کا قیمہ بنا کر حلق سے اُتارا ہوگا۔''

ڈاکٹر نے دوائی لگاتے ہوئے پوچھا۔

''اس بٹوے میں کیا تھا؟''

''اس بٹوے میں سو سو کے پانچ نوٹ تھے اور ایک انعامی بانڈ تھا جس پر دوسرا انعام نکلا تھا۔'' راجو نے ڈاکٹر کے سوال پر بتایا۔

اس بات پر ڈاکٹر چونک پڑا۔ زخموں پر دوائی لگانے والے ہاتھ یک دم رُک گئے۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دوائی کی شیشی گر گئی اور اس نے حیرانگی سے گدھے کو دیکھنا شروع کر دیا جیسے وہ جانور نہیں عجائب گھر کی کوئی چیز ہو۔

☆☆☆

یہ اس زمانے کی بات ہے جب آپ کے دور کے جنریٹر، ڈیپ فریزر اور مائیکرو ویو اوون جیسی مشینوں کا کہیں تصور بھی نہیں تھا۔ گھریلو خواتین صبح شام کا بچا کھچا کھانا، جانوروں کی دست برد یا سردی گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے چھینکے پر رکھتی تھیں۔ اس ٹوکری نما چیز کو کسی دروازے کی چوکھٹ یا برآمدے کی محراب کے درمیان لٹکا دیا جاتا اور اس میں چیز محفوظ کر دی جاتی تھی۔ ''چھینکے'' کا تعارف تو ہوگیا۔ اب بات کرنی ہے ٹوٹنے والے چھینکے کی، جو اماں رشیدہ کے ہاتھوں اور گھر کی بلی کے بھاگوں (قسمت) سے ٹوٹا۔

اماں رشیدہ اسی گھر میں رہتے رہتے بوڑھی ہوگئی تھیں اور اب تو بے چاری کے ہاتھ پیر بھی قابو میں نہ تھے۔ سر بھی ہلتا رہتا تھا جس کی جنبش نفی کی صورت میں ہوتی تھی۔ ویسے تو وہ ہر چیز بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھتی۔ مالکن کو اس پر پورا اعتماد تھا، مگر اس دن اللہ جانے کیا ہوا کہ جب اماں رشیدہ دوپہر کے بچے ہوئے سالن کی ہانڈی چھینکے پر رکھنے لگی تو اس کے ہاتھ کچھ زیادہ ہی بہک گئے۔ ہانڈی چھوٹتے ہی گھبراہٹ میں اس کا ہاتھ چھینکے کی رتی پر پڑ گیا۔ اس کی رتی اتنی مضبوط نہ تھی کہ اماں رشیدہ کے پورے جسم کا وزن سہار لیتی۔ چناں چہ چھینکا ہانڈی سمیت ٹوٹ کر مع اماں رشیدہ کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ شوربا تو اماں کے سر سے بہہ کر کپڑوں میں جذب ہونے لگا، بوٹیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں جنھیں دیکھ کر گھر کی پالتو بلی دوڑی آئی اور مزے سے بوٹیاں کھانے لگی۔

دھماکے کی آواز سن کر مالکن کمرے سے نکل آئیں۔ وہ اماں رشیدہ کی اس عجیب حالت پر حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگیں۔ بے چاری اماں کھسیانی ہو کر بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں:

''دیکھیے نا بیگم! یہ...... یہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا!!'' وہ ٹوٹی ہانڈی کی ٹھیکریاں چنتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ یہ بات سن کر مالکن کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ جانتی تھیں کہ اتفاقاً ایسا ہوگیا۔

''اچھا! اچھا! بلی کے بھاگوں ہی ٹوٹا ہوگا! تو جا کر یہ کپڑے بدل لے۔'' مالکن نے بڑھیا کی خفت مٹانے کے لیے نرمی سے کہا۔

جب ایک کے نقصان سے دوسرے کا فائدہ ہو جائے تو کہنے والے کہتے ہیں: ''واہ بھئی! یہ تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔''

پُرانے زمانے میں اگر کسی کو پاگل کتا کاٹ لیتا تو جانتے ہو اس کا علاج کون کرتا تھا؟ لوہار..... لوہار لوہے کی ایک سلاخ لیتا۔ اسے دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھ دیتا اور جب سلاخ بالکل لال ہو جاتی تو اس سے مریض کے زخم کو داغ دیتا۔ مریض اگر سخت جان ہوتا تو بچ جاتا ورنہ عام طور سے یہی ہوتا کہ نہ مرض رہتا نہ مریض۔ لوئی پاسچیئر نے بھی کئی بار اپنے گاؤں کے لوہار کو یہ جراحی کرتے دیکھا تھا اور دہشت سے وہ کانپ اُٹھا تھا۔

لوئی پاسچیئر فرانس کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ نپولین کی فوج میں سارجنٹ تھا مگر نپولین کے تخت سے اُتارے جانے کے بعد لوئی پاسچیئر کے باپ نے بھی غصے میں فوج سے استعفیٰ دے دیا اور چمڑہ بنانے کا کام کرنے لگا۔ وہ فرصت کے وقت اپنے بیٹے کو وطن کی بڑائیوں اور جنگ کی بُرائیوں کے قصے سناتا رہتا۔ باپ کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر اسکول ماسٹر بنے لیکن لوئی پاسچیئر سارا وقت تصویریں بناتا رہتا۔ اسے تصویریں بنانے کا بڑا شوق تھا۔

لوئی پاسچیئر نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی۔ پھر باپ نے اسے پیرس بھیج دیا تاکہ وہ اسکول ماسٹری کی تعلیم لے۔ پیرس میں اس کا جی بالکل نہ لگا۔ اسے اپنے گھر، گاؤں اور ماں باپ کی یاد ہر وقت ستاتی رہتی۔ لوئی پاسچیئر بیمار ہو کر گھر واپس آیا۔ طبیعت اچھی ہوئی تو اس کو ایک دوسرے شہر کے کالج میں بھیج دیا گیا۔ وہاں سے اس نے سائنس میں بی۔ اے پاس کیا لیکن اس کے سرٹیفکیٹ پر لکھا تھا کہ ''کیمسٹری میں کمزور ہے۔'' حالاں کہ بڑے ہو کر اس نے کیمسٹری ہی میں نام پیدا کیا۔

لوئی پاسچیئر نے اسکول ماسٹر بننے کا خیال ترک کر دیا اور پیرس کی مشہور سار باں یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے داخلہ لے لیا۔ اب اس کا زیادہ وقت کیمسٹری کے تجربوں میں صرف ہوتا۔ ان ہی دنوں یونیورسٹی کے ایک بڑے مشہور پروفیسر روشنی اور تیزاب پر کوئی تجربہ کر رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان کا تجربہ کیوں کامیاب نہیں ہوتا۔ لوئی پاسچیئر کو پروفیسر صاحب کی ناکامی کا علم ہوا تو اس نے سوچا کیوں نہ میں بھی اپنی قسمت آزماؤں۔ اتفاق دیکھو کہ چند دنوں کی محنت کے بعد وہ اپنے تجربے میں کام یاب ہو گیا۔ پروفیسر صاحب کو بتایا تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ لوئی پاسچیئر کو اسٹراس برگ یونیورسٹی کے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کا صدر بنوا دیا۔ چند ماہ بعد لوئی پاسچیئر نے اسٹراس برگ یونیورسٹی کے ریکٹر (صدر) کی بیٹی سے شادی کر لی۔ کہتے ہیں کہ شادی کے دن بھی لوئی پاسچیئر اپنی تجربہ گاہ کے اندر تجربوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ آخر اس کے دوستوں نے آ کر اسے یاد دلایا۔

لوئی پاسچیئر ہر دم اپنے تجربوں میں محو رہتا۔ اسے کھیل تماشے سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ایک بار فرانس کا بادشاہ نپولین سوئم اسٹراس برگ یونیورسٹی دیکھنے آیا۔ اس موقع پر یونیورسٹی میں بہت بڑا جشن منایا گیا۔ لوئی پاسچیئر اور اس کی بیوی بھی اس جشن میں مدعو تھے۔ صبح

کے وقت جب پاسچر کالج جانے لگا تو اس کی بیوی نے تاکید کی کہ دیکھئے گھر جلدی واپس آیئے گا۔ شام کو جشن میں چلنا ہے۔ دن شام میں اور شام رات میں بدل گئی مگر پاسچر گھر واپس نہ آیا اور جب رات گئے اس کی بیوی تجربہ گاہ میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ پاسچر اپنے کام میں مصروف ہے۔ بیوی نے شکایت کی تو اس نے کہا۔ ”مگر میں اس کام کو چھوڑ کر کیسے آسکتا تھا؟“ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اور اس کی بیوی جانتی تھی کہ اس کا شوہر کسی دفتر کا بابو نہیں ہے بلکہ ایک عظیم سائنس دان ہے۔ اس لیے اس نے کبھی پاسچر کو کام سے نہ روکا اور نہ گھر کے دھندوں میں پھنسایا۔ وہ اکثر اپنی بیوی کو یہ کہہ کر چھیڑا کرتا کہ گھبراؤ نہیں، میری وجہ سے تمہارا نام رہتی دُنیا تک روشن رہے گا۔“

کچھ عرصے بعد پاسچر لیل یونیورسٹی میں سائنس کا بڑا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ اس علاقے میں انگور کے باغ کثرت سے ہیں اور فرانس کی شراب سازی کی صنعت کا مرکز بھی یہی علاقہ ہے۔

ایک دن شراب سازی کے ایک کارخانے نے پروفیسر پاسچر کو مدعو کیا تاکہ وہ یہ بتائے کہ کارخانے کے بعض حوضوں کی شراب کھٹی اور بدمزہ کیوں ہوتی ہے اور بعض حوضوں کی خوش ذائقہ اور میٹھی کیوں ہوتی ہے۔ ایک پیپا اچھی شراب کے خمیر کا اور دوسرا پیپا خراب شراب کے خمیر کا اس کے سامنے رکھا گیا پاسچر نے دونوں خمیروں کو غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ اچھے خمیر کے قطرے گول ہیں اور خراب خمیر کے لمبے لمبے۔ اس سے پاسچر نے یہ قیاس کیا کہ دراصل خمیروں میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ ان میں ہوا کے ذریعے بعض ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو خمیر کو خراب کر دیتی ہیں۔ اس نے ان خمیروں پر تجربہ کیا اور خوردبین سے دیکھا تو اس کا قیاس بالکل ٹھیک نکلا۔ لوئی پاسچر نے جراثیم کا اصول دریافت کر لیا اور یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔

لوئی پاسچر سے پیشتر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ کیڑے اور جراثیم وغیرہ غلیظ اور گلی سڑی چیزوں میں خود بخود پیدا ہوتے ہیں یا یوں سمجھو کہ یہی گلی سڑی چیزوں کے اجزاء کیڑے اور جراثیم بن جاتے ہیں۔ یعنی بے جان مادے سے جاندار چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ لوئی پاسچر نے لگاتار تجربوں سے ثابت کر دیا کہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ گلی سڑی چیزوں میں کیڑوں اور جراثیم پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے بلکہ یہ کیڑے اور جراثیم پھل، گوشت، سبزی اور دوسری چیزوں میں ہوا کے ذریعہ داخل ہوتے ہیں اور انہیں سڑا دیتے ہیں۔

اس حیرت انگیز انکشاف کی وجہ سے پاسچر ساری دُنیا میں مشہور ہو گیا۔ لوگ اسے اپنے زمانے کا سب سے بڑا کیمسٹ ماننے لگے اس کے نظریہ جراثیم کا تجربہ زخموں پر کیا گیا تو پتا چلا کہ جن زخموں کو باہر کے جراثیم سے محفوظ کر لیا جائے، وہ خراب نہیں ہوتے اور نہ ان میں زہر پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح پاسچر نے لاکھوں زخمیوں کو موت سے بچا لیا۔

چند سال بعد فرانس کی حکومت نے لوئی پاسچر سے درخواست کی کہ وہ ریشم کے کیڑوں کی بیماری کی تحقیقات کرے کیوں کہ یہ کیڑے لاکھوں کی تعداد میں مر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے فرانس

کی ریشم کی صنعت تباہ ہوتی جا رہی تھی۔ تین سال کی کوشش کے بعد لوئی پاسچر نے وہ جراثیم دریافت کر لیے جو ریشم کے کیڑوں کو ہلاک کرتے جا رہے تھے۔ اسی دوران اس پر فالج کا حملہ ہوا مگر اس نے تحقیقات برابر جاری رکھی اور اس وقت تک آرام نہ کیا جب تک اس کا تجربہ کام یاب نہ ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد لوئی پاسچر ساربان یونیورسٹی میں کیمسٹری کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ یہ وہی یونیورسٹی تھی جہاں اس نے سب سے پہلے تجربے کیے تھے اور تب اس نے ''خمیر'' پر اپنی شہرۂ آفاق کتاب شائع کی۔ اب اس کا سارا وقت جراثیم کی تحقیقات میں صرف ہونے لگا۔ ان ہی دنوں فرانس میں مرغیاں کالرے سے مرنے لگیں تو پاسچر نے کالرے کے جراثیم دریافت کیے اور مرغیوں کے لیے ایک ٹیکہ تیار کیا۔ اس ٹیکے کے لگانے سے مرغیاں کالرے سے بالکل محفوظ ہو گئیں۔

یہ تجربہ کام یاب ہوا تو لوئی پاسچر پاگل کتے کے کاٹے کا علاج دریافت کرنے میں لگ گیا۔ اس نے سوچا اگر مرغیاں کالرے کے جراثیم کو مار کر بچائی جا سکتی ہیں تو پھر پاگل کتے کے کاٹے کا علاج کیوں نہیں ہو سکتا۔ پاگل کتے کے اندر بھی تو زہریلے جراثیم ہی ہوتے ہیں جو انسان کے خون میں پہنچ جاتے ہیں۔

پاگل کتا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ وہ کاٹ لے تو دو چار دن آدمی کو کچھ محسوس نہیں ہوتا لیکن اس کا زہر اندر ہی اندر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ پھر طبیعت گرنے لگتی ہے۔ سر میں درد ہوتا ہے۔ اور مریض بہت زیادہ باتیں کرنے لگتا ہے۔ پیاس بڑھ جاتی ہے اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے پانی سے ڈر آنے لگتا ہے۔ وہ پانی پینا چاہتا ہے، مگر پی نہیں سکتا اور تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ اسی لیے اگر کبھی پاگل کتا کاٹ لے تو آدمی کو چاہیے کہ فوراً ٹیکہ لگوائے۔ اگر کتا پاگل نہ ہو تب بھی ٹیکہ لگوا لینا چاہیے کیوں کہ بعض اوقات یہ پتا چلانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کتا پاگل تھا یا نہیں۔

لوئی پاسچر نے پاگل کتے کے کاٹے کا علاج دریافت کرنے کے لیے بہت سے پاگل کتے اپنی تجربہ گاہ میں اکٹھے کیے۔ وہ ان کے جراثیم کا غور سے مطالعہ کرتا اور دن رات ان پر تجربے کرتا رہتا۔ ان پاگل کتوں کے ہاتھوں خود اس کی زندگی ہر دم خطرے میں رہتی۔ ایک بار تو کتوں کا زہریلا لعاب جسے وہ شیشے کی نالی میں منہ سے کھینچ رہا تھا اس کے منہ میں چلا گیا مگر لوئی پاسچر نے پرواہ نہ کی۔ آخر وہ اپنا ٹیکہ تیار کرنے میں کام یاب ہو گیا۔ اس نے یہ ٹیکہ ایک پاگل کتے پر آزمایا تو کتا اچھا ہو گیا۔

کیا آدمی کو بھی یہ ٹیکہ لگایا جا سکتا ہے اور اگر لگایا جائے تو دوا کی مقدار کتنی ہو؟ یہ تھے وہ سوالات جو پاسچر کو پریشان کر رہے تھے۔ لیکن ان کا جواب آدمی پر تجربہ کیے بغیر نہیں دیا جا سکتا تھا۔

آخر ایک دن لوگ آٹھ نو برس کے ایک لڑکے کو لے آئے۔ اس کو پاگل کتے نے کئی دن پیشتر کاٹا تھا اور اس کی حالت بہت نازک تھی۔ لوئی پاسچر نو دن تک اس بچے کو ٹیکے لگاتا رہا۔ تین ہفتے کے بعد لڑکے کی حالت سنبھلنے لگی اور تین مہینے میں وہ بالکل اچھا ہو گیا۔ بچے کے اچھے ہونے کی خبر بجلی کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئی۔ لوئی پاسچر کی شہرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اخباروں نے اسے ''انسان کا نجات دہندہ'' کہہ کر یاد کیا۔ فرانس نے اسے اپنی اکیڈمی کا رکن بنا کر سب سے بڑا اعزاز بخشا اور جب فرانس کے لوگوں سے پوچھا گیا کہ فرانس کی سب سے بڑی شخصیت کون ہے تو سب سے زیادہ ووٹ لوئی پاسچر کو ملے۔ نپولین کا نمبر پانچواں تھا۔

اتنی شہرت اور عزت کے باوجود لوئی پاسچر نے تمام عمر بڑی سادہ زندگی بسر کی۔ وہ بڑا نیک دل اور سیدھا انسان تھا۔ مریضوں کو دکھ میں دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوتا اور جب تک وہ اچھے نہ ہو جاتے اسے چین نہ آتا۔

اس کی زندگی میں غم کئی بار آئے۔ اس کی سب سے بڑی بیٹی نو سال کی عمر میں انتقال کر گئی۔ ابھی وہ اس غم سے سنبھلا نہ تھا کہ اس کی دو سال کی بچی اور بارہ سال کا بیٹا فوت ہو گئے۔ جرمنی نے فرانس پر حملہ کیا تو اس کا بڑا بیٹا فوج میں بھرتی ہو گیا مگر کچھ عرصے کے بعد خبر آئی کہ اس کا بیٹا گم ہو گیا ہے۔ لوئی پاسچر جوان بیٹے کی گم شدگی سے قریب قریب دیوانہ ہو گیا۔ آخر بڑی تلاش کے بعد بیٹا ملا لیکن وہ سخت بیمار تھا۔ ماں باپ نے اس کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیے۔ کچھ عرصہ بعد وہ اچھا ہو گیا۔

اس لڑائی کا لوئی پاسچر پر اتنا اثر ہوا کہ اسے جنگ سے شدید نفرت ہو گئی اور وہ جرمنوں کے سخت خلاف ہو گیا۔ چناں چہ جب ایک جرمنی یونیورسٹی نے اسے اعزازی تمغہ پیش کیا تو اس نے یہ تمغہ لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے لکھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ سائنس اور امن، جہالت اور جنگ پر فتح پائیں گے۔ قوموں کے درمیان ربط اس لیے نہ ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کو تباہ کریں بلکہ ایک دوسرے کا احترام کرنے کی خاطر اور مستقبل ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو گا جو دُنیا کے دکھی انسانوں کی سب سے زیادہ خدمت کریں گے۔'' ☆☆☆

آج بھی ہندوستان کے علاقے میسور میں موجود مسجدِ اعلیٰ اس ''شیر'' کی یاد دلاتی ہے جو کبھی میسور کے تخت پر براجمان تھا اور اس کا دور اس ریاست کی خوش حالی کا ایسا دور تھا جو آج خواب و خیال کی باتیں محسوس ہوتی ہیں۔ یہ مسجد میسور کے حکمران، سلطان ٹیپو نے بنائی تھی، جس کا اصل نام فتح علی تھا۔ سلطان ٹیپو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جب آٹھ سال کا تھا تو اس وقت کسی بزرگ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تھا کہ تم ایک دن میسور کے بادشاہ بنو گے۔ جب ایسا ہو جائے تو اس جگہ ایک مسجد ضرور تعمیر کرانا۔ سلطان ٹیپو نے حکمران بنتے ہی یہ وعدہ پورا کیا۔

اس سے قبل ریاست کا حاکم اس کا والد حیدر علی تھا۔ حیدر علی، دراصل میسور کا بانی اور پہلا حکمران تھا۔ حیدر علی کے والد ایک لڑائی میں مارے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ سرنگا پٹم اپنے چچا کے پاس آ گیا۔ اس وقت حیدر علی کی عمر کم تھی۔ اس نے اپنے چچا سے فن سپہ گری سیکھی اور پھر راجہ میسور کی ملازمت اختیار کر لی۔ 1755ء میں وہ فوج کے سپہ سالار بنے اور پھر انہوں نے راجہ کو نااہلی کے سبب معزول کر کے خود ریاست کے حکمران بن گئے۔ انہوں نے حسنِ تدبر سے ریاست کو توسیع دی اور انصاف قائم کیا۔ انہوں نے انگریزوں سے دو بڑی جنگیں لڑیں۔ پہلی جنگ میں انہیں شکست ہوئی، جب کہ دوسری جنگ میں انہوں نے انگریزوں کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ دسمبر 1784ء میں ان کا انتقال ہوا تو اس وقت ان کے فرزند فتح علی ٹیپو کی عمر فقط 32 سال تھی۔ باپ کے بعد وہ تخت نشین ہوا۔ تاریخ اسے ''سلطان ٹیپو'' کے نام سے اچھے الفاظ سے یاد کرتی ہے۔

باپ کے انتقال کے بعد سلطان ٹیپو نے فوج اور فوجی سامان پر خاص توجہ دی، کیوں کہ جنگ کا میدان مسلسل گرم تھا۔ کبھی قریبی ریاستوں سے جنگ ہوتی تو کبھی انگریز حملہ آور ہوتے۔ جب جنرل کیمبل نے قلعہ احمد نگر کی جانب حملہ کیا تو سلطان ٹیپو نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں عبرت ناک شکست دے کر مار بھگایا۔ اس جنگ میں جنرل کیمبل اور اس کے تقریباً ایک ہزار سپاہی گرفتار ہوئے۔

انگریزوں کے ساتھ ساتھ سلطان ٹیپو کو قریبی دیسی ریاستوں کے راجوں سے بھی جنگ کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ان راجوں مہاراجوں نے انگریزوں سے اپنے ملک کی آزادی کا سودا کر لیا ہے اور ہندوستان کو غلام بنانے میں دشمن کا بھرپور ساتھ دے رہے ہیں۔ سلطان ٹیپو کو اس بات کا بھی بے حد دکھ تھا کہ

ہندوستان کے اصل باشندے آج غیروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ انگریز کبھی بھی ہندوستان کا خیر خواہ نہیں ہوسکتا۔

1792ء میں لارڈ کارنوالس نے سرنگا پٹم پر حملہ کیا تو اس کے ساتھ اطراف کی حیدر آبادی اور مرہٹہ افواج بھی تھیں۔ ان افواج کی مجموعی تعداد تقریباً 81 ہزار تھی۔ سلطان ٹیپو کو جب یہ معلوم ہوا کہ کئی قلعہ داروں نے اس سے نمک حرامی کر کے کئی قلعے دشمنوں کے حوالے کر دیئے ہیں تو آخرکار سلطان ٹیپو کو انگریزوں کے ساتھ ناپسندیدہ اور ذلت آمیز شرائط پر صلح کرنا پڑی۔

1798ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل شاہی خاندان کا لارڈ ولزلی بن کر آیا۔ اس نے آتے ہی ٹیپو سلطان کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ 1799ء میں اس کی ہدایت پر جنرل ہیرس انگریزی اور حیدر آباد افواج کے ہمراہ سرنگا پٹم پر حملہ آور ہوا۔ ٹیپو سلطان نے ان کا مقابلہ جواں مردی سے کیا۔ جنگ کے دوران ہی سلطان ٹیپو کو احساس ہوگیا کہ اس کے چند وزیر در پردہ انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں۔

28 اپریل 1799ء کو سرنگا پٹم کے باہر توپیں نصب کر دی گئیں اور گولہ باری شروع ہوگئی۔ 3 مئی کو قلعے میں چھوٹا سا شگاف پڑ گیا۔ جنرل ہیرس کا ارادہ تھا کہ فوراً حملہ کیا جائے مگر اس کے پاس رسد کی کمی تھی۔ اس موقع پر غدار ملت میر صادق نے اسے مشورہ دیا کہ بھرپور حملہ 4 مئی کی دوپہر کو کیا جائے۔ اس وقت میر صادق نے تنخواہ دینے کے بہانے سپاہیوں کو اندر بلا لیا جو قلعے کی فصیل پر شگاف والے حصے پر حفاظت کے لیے موجود تھے۔ اس کے بعد انگریز فوج بغیر کسی مزاحمت کے قلعے میں داخل ہوگئی۔

ٹیپو سلطان اس وقت دفاعی انتظامات میں مصروف تھے۔ اس روز دوپہر کا کھانا ان کے سامنے لایا گیا۔ انہوں نے ابھی لقمہ اُٹھایا ہی تھا کہ انہیں اپنے وفادار ساتھی سید عبدالغفار کی شہادت کی اطلاع ملی۔ وہ کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا:

''ہم بھی عن قریب جانے والے ہیں۔'' اسی دوران میر صادق کی غداری دوسرے سپاہیوں پر ظاہر ہو چکی تھی اور انہوں نے اسی وقت تلوار سے اس کا سر جسم سے علیحدہ کر دیا۔

ٹیپو سلطان باہر نکل کر جواں مردی سے لڑے۔ ان کا کہنا تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ گیدڑ بزدلی کی علامت ہوتا ہے اور ٹیپو سلطان شیر کی طرح طاقت اور ارادے کے مالک تھے۔ ''میسور کا شیر'' پوری طاقت کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود بزدل دشمنوں پر بھاری تھا۔

کھوج لگانیے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

فراست علی، محمد ابرار، جواد احمد، عبید الیاس، عثمان نعیم، کراچی۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ احمد عبداللہ، میانوالی۔ رامین رضوان، راول پنڈی۔ محمد ناصر، اسلام آباد۔ محمد شہزاد صوفی (قادری)، رحیم یار خان۔ سید حسن نوشاہی، لاہور۔ سید حسن نوشاہی، لاہور۔ لائبہ جمیل، لاہور۔ اسامہ خباب علی، قنگی۔ اریبہ شہرین، لاہور۔ نوریہ مدثر، سیال کوٹ۔ افنان بن سیف، اسلام آباد۔ داؤد ابراہیم ورک، ہودا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ محمد شمعون بٹ، لاہور۔ ابرار الحق، راجہ جنگ۔ عثمان علی بھٹی، لاہور۔ اسامہ بن خرم، گوجر خان۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ بشریٰ خالد، لاہور۔ خدیجہ خرم انصاری، لاہور۔ محمد شکیل بھٹی، جھنگ۔ شاہ نور، گجرات۔ محمد طلحہ سلمان، لاہور۔ شاہ زیب، کراچی۔ محمد عثمان، کراچی۔ محمد وسیم، کراچی۔ عادل خان، کراچی۔ محمد صدیق قیوم، قصور۔ مہرین شہزاد، پشاور۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ فاطمہ جاوید، نوشہرہ۔ فرحان اشرف، ہارون آباد۔ آمنہ غفار، اسلام آباد۔ میمونہ ضیاء، حافظ آباد۔ آمنہ واسطی، کراچی۔ عربہ راشد، لاہور۔ وردہ انمول، سیال کوٹ۔ آفتاب عدیل، لاہور۔ مریم فاطمہ، کراچی۔ نفیسہ فاطمہ قادری، عائشہ فاطمہ قادری، خدیجہ نشان، محمد صفدان رضا قادری، محمد رضوان رضا قادری، کاموکی۔ علینا اختر، کراچی۔ وردہ زہرہ، جھنگ۔ سندس آپیہ، کراچی۔ عدن سجاد، جھنگ۔ علیمہ شہباز، بورے والا۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ محمد فہد بٹ، جہلم۔ محمد اسد، کراچی۔ مسفرہ ظفر اقبال، راول پنڈی۔ انس امین، کراچی۔ شیزہ جاوید، گوجرانوالہ۔ عبدالرافع خان، اسلام آباد۔ حذیفہ آصف، راول پنڈی۔ زین العابدین، اسلام آباد۔ عائشہ ظفر، رحیم یار خان۔ محمد احمد رضا، دنیا پور۔ اسماء صادق، حفصہ، واہ کینٹ۔ شاہ زیب احمد، راول پنڈی۔ طاہر علی ضیاء، اسلام آباد۔ محمد عرفان آفریدی، جمرود۔ محمد ذیشان، حمزہ چھول نذیر، احمد پور لمہ۔ بشریٰ رانا، شیخوپورہ۔ کرن اقبال، میانوالی۔ خنساء کاشف، کراچی۔ محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور۔ عائشہ ذوالفقار، لاہور۔ طوبیٰ بنت عبدالرؤف قریشی، کراچی۔ ریحان حبیب، لاہور۔ محمد یاسر، کے پی کے۔ اقدس شاہد، کراچی۔ محمد فاروق، لاہور۔ حافظ اسامہ، لاہور۔ حافظ محمد سعد مظہر، شیخوپورہ۔ وضیاء فاطمہ، فیصل آباد۔ منابل نسیم، اسلام آباد۔ اقراء مطلوب قریشی، میر پور آزاد کشمیر۔ محمد منیب ستار، سیال کوٹ۔ عبدالبصیر، حسن بابر، لاہور۔ محمد سیف الرحمن، میانوالی۔ نمرہ اقبال، کراچی۔ عارفہ شیخ، حیدر آباد۔ سیفی مجاہد حسین، ساہی وال۔ امامہ شبیر، فیصل آباد۔ رکیمین زہرہ، بہاول پور۔ سمیرا گل ناز، کراچی۔ فاطمہ وحید، لاہور۔ محمد نعیم کمبوہ، لاہور۔ محمد سعد، لاہور۔ محمد شافع، کراچی۔ اریبہ جمشید، لاہور۔ ماہین، راول پنڈی۔ طیبہ ارشد، لاہور۔ شیروتیہ شاہ، حیدر آباد۔ عاتکہ رحیم، جوہر آباد۔ سیدہ ذولہ ہاشمی، ذیرہ اسماعیل خان۔ محمد حارث سعید، بورے والا۔ منصور اعجاز، بہاول نگر۔ سیدہ امامہ تنویر، کراچی۔ تہنیت آفرین، منڈی بہاؤ الدین۔ آمنہ مظہر، لاہور۔ عبدالرحمن رضا، خان بیلہ۔ محمد فرحان سعید احمد، لاہور۔ مزمل آصف، کراچی۔ فاطمہ اظہار، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ عبدالبصیر، اختر آباد۔ محمد عثمان غنی، بہاول پور۔ ماریہ اعظم، گوجرانوالہ۔ جواد اعجاز، ہاڑہ ہملٹ۔ اسماء رانی، لاہور۔ ماریہ حسن، لاہور۔ حرا سعید شاہ، جوہر آباد۔ بلال صفدر قرنی، ساہی وال۔ کومل ادریس، کراچی۔ عمیر راشد، راول پنڈی۔ محمد بلال عتیق، فیصل آباد۔ محمد اکرم صدیقی، میانوالی۔ نیحہ شاہد، کراچی۔ عمیر مجید، ٹوبہ۔ زویا احمد، راول پنڈی۔ راؤ محمد طلحہ صفدر، ملتان۔ شمیر ناصر، گکھڑ۔ فاطمہ تحریم، کراچی۔

زخمی سلطان ٹیپو سے ایک انگریز سپاہی نے اس کی قیمتی تلوار چھیننے کی کوشش کی۔ زخمی سلطان نے تلوار کا وار کیا جس سے وہ انگریز سپاہی زخمی ہوگیا۔ دوسرے نے گولی چلا دی۔ زخمی حالت میں بھی سلطان ٹیپو نے تین افراد کو ہلاک کیا اور بالآخر کنپٹی پر لگی گولی سے یہ بہادر جرنیل شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور تابندگی تھی۔

دوسرے دن محل سے سلطان ٹیپو کا جنازہ اُٹھایا گیا۔ جنازے کا جلوس جس راستے سے گزرتا، وہاں دونوں جانب کھڑے شہریوں کا جم غفیر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ سلطان کو اس کے والد حیدر علی کے پہلو میں لال باغ کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔

ٹیپو سلطان میں بے پناہ خوبیاں تھیں، جس کے سبب وہ اپنی رعایا میں ہر دل عزیز تھے اور یہی غم ان کی شہادت کے بعد جنازے کے دوران لوگوں کے چہروں پر دیکھا گیا۔

سلطان ٹیپو روزانہ صبح سویرے ہی اُٹھ جاتے تھے۔ نماز فجر کے بعد ایک گھنٹے تک قرآن مجید کی تلاوت لازماً کیا کرتے تھے۔ پھر ورزش کرتے اور اس کے بعد ناشتا۔ ان کا ناشتا دودھ اور پھلوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس دوران خطوط کے جوابات لکھواتے اور پھر فوج کا معائنہ کرتے۔ نماز ظہر کے بعد فوجی کارخانوں کا معائنہ ہوتا۔ شام کو مختلف شعبوں کے کام کی رپورٹ سنتے۔

رات کے کھانے پر امراء اور افسران سے گفتگو رہتی۔ وہاں سبھی انتظامی معاملات زیر بحث آتے تو کبھی تاریخی موضوعات اور شعر و شاعری کا ذکر رہتا۔ سونے سے قبل چہل قدمی کرتے اور پھر اپنے کمرے میں جا کر کسی کتاب کا مطالعہ کرتے۔ سلطان دن میں صرف دو وقت کا کھانا کھاتے تھے۔ ریاست کی زبان فارسی تھی۔

سلطان ٹیپو ہر وقت باوضو رہتے تھے۔ مزاج میں انتہائی سادگی تھی۔ انہیں یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی ان کے احترام کے لیے کھڑا ہو یا جھک کر سلام کرے۔ انہوں نے ریاست کا آئین بنایا جو ''آئینِ سلطانی'' کہلایا۔ وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے منتظم (ایڈمنسٹریٹر) تھے۔ وہ اپنی سلطنت کو ''سلطنتِ خداداد'' کہا کرتے تھے جس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سلطنت ہے۔

ان کے دور میں صنعتی ترقی عروج پر تھی۔ سرنگا پٹم سمیت دیگر علاقوں میں قینچیاں، چاقو، گھڑیاں، تیر، دستی بندوقیں، بارود، کاغذ اور برتن بنانے کے کئی کارخانے قائم تھے۔ قلعہ سرنگا پٹم میں کاغذ سازی کا بڑا کارخانہ تھا۔ یہاں شکر سازی کا بھی کارخانہ تھا۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ بہترین قسم کی شکر بنانے کی ترکیب کو عام نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی تیاری کا طریقہ ٹیپو سلطان نے خود ایجاد کیا تھا۔ بنگلور میں اعلیٰ قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ چینی کے برتن اور شیشے کے گلاسوں کا کارخانہ بھی تھا۔ لکڑی کے کام کے لیے میسور مشہور تھا۔ چناپٹنا میں لکڑی کی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔ کہیں سرخ چمڑا بن رہا ہے تو کہیں قالین تیار ہو رہے ہیں۔ اس دور میں کاغذ پہ سونے کا رنگ چڑھانے کی صنعت بھی تھی۔ اس نے کان کنی کو بھی فروغ دیا۔ اور تو اور سرمایہ کاری کے لیے بینک بھی موجود تھے۔

سلطان ٹیپو علم پرور تھے۔ اسلامی علوم کے علاوہ انہیں عربی، فارسی، انگریزی، اُردو، تامل اور کنٹری زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ ملک کے کونے کونے سے علماء، ادیب اور شاعر میسور میں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ سلطان ٹیپو مطالعے اور اچھی کتابوں کے قدردان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے ذاتی کتب خانے میں لاتعداد نایاب کتب، قلمی مسودات اور مخطوطات موجود تھے۔

علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کو اپنے شعری مجموعے ''بانگِ درا'' میں شان دار خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان پر ایک نظم ''سلطان ٹیپو کی وصیت'' بھی لکھی جس کا پہلا شعر ہے:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

سلطان ٹیپو نے صرف سترہ برس حکومت کی اور اس دوران اپنی رعایا کا ہر ممکن خیال رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ عوام بھی اس محبوب رہنما کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ ایک انگریز جان ہنڈرس، سلطان ٹیپو کے بارے میں رقم طراز ہے:

''ٹیپو سلطان ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت کا حامل تھا جس کا بدل شاید ہندوستان بھر میں پیدا نہ ہوا ہو۔ وہ ایک بہادر انسان تھا جو سپاہی کی طرح اس دُنیا میں آیا اور سپاہیانہ موت مرا۔ وہ اپنے ملازمین پر مہربان اور ان لوگوں کے لیے شفیق تھا جو اس سے محبت کرتے تھے۔''

☆☆☆

جولی سانگ اس کی بیوی شانتا کی شکل میں سفر کر رہی تھی۔ اسے ایک پل کے لیے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ جولی سانگ ہے اور اس مکار شخص پانڈو کی بیوی نہیں ہے۔ ست پڑا کی وادی بڑی دشوار گزار تھی یعنی اس میں سے گزرنا بڑا مشکل کام تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں، گھاس اور درخت اُگے ہوئے تھے۔ جولی سانگ نے پانڈو سے پوچھا۔ ''پانڈو تمہارا وہ پُرانا قلعہ کہاں ہے؟ ہم دو روز سے سفر کر رہے ہیں۔''

پانڈو نقشے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اسی وادی میں ہے شانتا۔ بس ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی والے ہیں۔''

شانتا یعنی جولی سانگ نے کہا۔ ''کیا تمہارا خزانہ اس پُرانے قلعے میں ابھی تک محفوظ پڑا ہو گا؟'' عیار نجومی مسکرایا۔ ''شانتا! تم بالکل فکر نہ کرو۔ قلعے میں جائیں گے تو خزانہ تمہارے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دوں گا، بس تم ذرا صبر کرو۔''

پانڈو نجومی نے جولی سانگ کو بالکل نہیں بتایا تھا کہ اسے قلعے کے قبرستان میں ایک پُرانی قبر کے مُردے سے بات کرنی ہو گی۔ وہ ابھی اسے یہ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ سورج غروب ہونے لگا تھا۔ وہ وادی میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے کہ پانڈو نجومی نقشے کو دیکھتے ہوئے رُک گیا۔ پھر اس نے ایک چھوٹے سے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''پُرانا قلعہ اس ٹیلے کی دوسری طرف ہونا چاہیے، میرا نقشہ یہی کہہ رہا ہے۔''

جب وہ ٹیلے کی دوسری طرف پہنچے تو سچ مچ ایک قدیم قلعے کا کھنڈر نظر آیا۔ قلعے کی سیاہ دیواریں آدھی سے زیادہ ڈھے چکی تھیں۔ ان دیواروں پر جنگلی گھاس اُگ رہی تھی۔ جولی سانگ نے قلعے کے کھنڈر کو دیکھ کر کہا۔ ''پانڈو! لگتا ہے اس قلعے کے اندر سوائے چوہوں اور چھپکلیوں کے اور کچھ نہیں ہو گا۔'' پانڈو مسکرایا۔

''تم چلو تو سہی۔ خزانہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔''

نجومی پانڈو نے دوسرے گھوڑوں پر کدالیں اور پھاوڑے لاد رکھے تھے۔ وہ سارا انتظام کر کے چلا تھا۔ قلعے کا دروازہ غائب تھا، اس کی جگہ صرف ایک ٹوٹی ہوئی محراب کھڑی تھی۔ اندر ستون گرے ہوئے تھے۔ اسی قلعے کے اندر پیچھے کی جانب درختوں کے نیچے ایک پُرانا قبرستان تھا۔ نجومی پانڈو کو ستاروں کے حساب سے معلوم ہو چکا تھا کہ جس قبر کی وہ تلاش میں ہے، وہ اسی قبرستان میں ہے۔ چناں چہ وہ اس قبر پر پہنچ گیا۔ جولی سانگ نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیا خزانہ اسی قبر میں بند ہے؟''

نجومی پانڈو نے کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ خزانہ اسی قبر میں بند ہے۔ آؤ قبر کو کھودتے ہیں۔''

گھوڑے ایک طرف باندھ دیئے گئے تھے۔ نجومی پانڈو نے گھوڑوں پر لدے ہوئے جھولے میں سے ایک کدال نکالی اور قبر

کے پتھر ہٹانے شروع کر دیئے۔ جولی سانگ بھی بڑے شوق سے قبر کو دیکھ رہی تھی کہ ابھی اس کے نیچے بیش بہا خزانہ نکل آئے گا، مگر جب قبر کھلی تو اس کے اندر خزانے کی بجائے ایک لاش کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ جولی سانگ نے کہا۔ ''پانڈو! تم تو کہتے تھے کہ اس میں خزانہ ہوگا لیکن یہاں تو ایک انسان کا ڈھانچہ پڑا ہے۔ اس کو کھودنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟'' پانڈو نے کہا۔ ''شانتا! یہ اس آدمی کا ڈھانچہ ہے جو اس قلعے کے راجہ کا خزانچی تھا۔ صرف اس آدمی کو معلوم تھا کہ خزانہ کس جگہ دفن کر دیا گیا ہے کیوں کہ اس قلعے پر دشمن نے حملہ کر دیا تھا۔'' جولی سانگ بڑی حیران ہوئی۔

''مگر اب تو یہ خزانچی مر چکا ہے، بلکہ اس کی ہڈیاں بھی مٹی بن رہی ہے۔ اب یہ خزانے کے بارے میں تمہیں کیا بتا سکے گا؟''

نجومی پانڈو نے کہا۔ ''شانتا! یہی مُردہ بتائے گا کہ خزانہ کس جگہ پر دبایا ہوا ہے۔'' چوں کہ جولی سانگ یہ بھول چکی تھی کہ وہ مُردوں سے بات کر سکتی ہے اور یہ کہ وہ جولی سانگ ہے، اس لیے پریشان ہو کر کہنے لگی۔ ''پانڈو! کیا تم مُردوں سے بھی بات کر لیتے ہو؟''

نجومی پانڈو بولا۔ ''مُردے سے میں نہیں بلکہ تم بات کرو گی۔''

اب تو جولی سانگ دنگ ہو کر رہ گئی۔

''پانڈو! میں کسی مُردے سے کیسے بات کر سکتی ہوں؟ اور پھر مردہ میری بات کہاں سنے گا؟''

پانڈو نے کہا۔ ''میں اس مُردے کے ڈھانچے پر ایک خاص منتر پڑھ کر پھونک دوں گا۔ اس کے بعد جب تم اس سے سوال کرو گی تو یہ تمہارے سوال کا جواب دے گا۔''

جولی سانگ کچھ ڈر سی گئی۔ کہنے لگی۔ ''میں کیوں بات کروں گی۔ تم بات کیوں نہیں کرتے اس سے؟ مجھے تو مُردے سے بات کرتے ہوئے ڈر آتا ہے۔'' نجومی پانڈو جانتا تھا کہ سوائے جولی سانگ کے دوسرا کوئی مُردے سے بات نہیں کر سکتا۔ اس نے کہا۔ ''میں تمہارے پاس ہوں گا تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر میں مُردے کے ڈھانچے پر منتر پڑھ کر پھونک دوں گا۔ تم بے خوف ہو کر اس سے سوال کرنا۔''

جولی سانگ نے جو اپنے آپ کو شانتا سمجھ رہی تھی، پوچھا۔

''مجھے مُردے سے کیا پوچھنا ہوگا؟''

نجومی پانڈو نے نقشہ جیب میں ڈالا اور بولا۔ ''جو جو میں تمہیں کہتا جاؤں گا تم مُردے سے پوچھتی جانا۔ اب میں اس پر منتر پھونکنے لگا ہوں۔''

نجومی پانڈو کو مُردے پر منتر پھونکنے کی کیا ضرورت تھی۔ ویسے اس کے پاس کوئی ایسا منتر نہیں تھا جس کے پھونکنے سے مُردے باتیں کرنے لگیں۔ وہ تو جانتا تھا کہ جولی سانگ جب مُردے کو ہاتھ لگائے گی تو مُردہ اس سے بات کرنے لگے گا۔ جولی سانگ چوں کہ اپنی یادداشت بھول چکی تھی، اس لیے وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ مُردہ پانڈو کے منتر کی وجہ سے مجھ سے بات کرے گا۔

نجومی پانڈو نے یوں ہی ایک اوٹ پٹانگ منتر پڑھ کر قبر میں پڑے ہوئے ڈھانچے پر پھونکا اور پھر جولی سانگ سے کہا۔

''شانتا! اب تو ایسا کر کہ لاش کے ڈھانچے کی کھوپڑی کو اپنا ہاتھ لگا اور اس سے پوچھ کہ محل کا خزانہ کس جگہ دفن ہے۔''

شانتا نے ڈرتے ڈرتے لاش کی کھوپڑی کو ہاتھ لگایا تو کھوپڑی جو ٹیڑھی تھی، سیدھی ہو گئی۔ شانتا ڈر گئی مگر نجومی پانڈو خوشی سے اُچھل پڑا۔ اس نے شانتا سے آہستہ سے کہا۔ ''اب اس سے پوچھ کہ راجہ کا خزانہ کس جگہ پر دفن کیا گیا تھا؟''

شانتا نے جب مُردے سے پوچھا کہ راجہ کا خزانہ کس جگہ پر دفن ہے تو کھوپڑی کا جبڑا ہلا اور اس کے اندر سے آواز آئی۔

''جولی سانگ! یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟''

پانڈو کو فکر پڑ گئی کہ کہیں یہ مُردہ بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ جولی سانگ نے تعجب سے پانڈو کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ کس جولی سانگ کا نام لے رہا ہے؟''

نجومی پانڈو نے سختی سے کہا۔ ''مُردے کو کہو کہ پھر جولی سانگ کا نام نہ لینا اور جو میں کہتی ہوں صرف اس کا جواب دو، فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔''

جولی سانگ نے یہی کچھ مُردے کے ڈھانچے کو کہہ دیا۔ کھوپڑی نے کہا۔ ''تو پوچھو، تم کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

جولی سانگ نے سوال کیا۔ ''راجہ کا خزانہ اس قلعے میں کس جگہ دفن کیا گیا تھا؟''

کھوپڑی نے کہا۔ ''قلعے کے پیچھے ایک اصطبل کا کھنڈر ہے۔ اس کھنڈر کی شمالی دیوار کے پاس ایک گول پتھر زمین کے باہر اُبھرا ہوا ہے۔ راجہ کا خزانہ میں نے اس پتھر کے نیچے دفن کروایا تھا۔''

نجومی پانڈو کو لاش سے بس یہی کچھ معلوم کرنا تھا۔ اس نے جولی سانگ کو قبر سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لاش کا ڈھانچہ خاموش ہو گیا تھا۔ جب اس سے دوسرا کوئی سوال نہ پوچھا گیا تو کھوپڑی خود بخود ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ پانڈو نجومی نے قبر کو پتھروں سے

بند کر دیا جولی سانگ بولی۔ "پانڈو! کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے ایک لاش سے بات کی ہے۔" جولی سانگ یہ بھول گئی تھی کہ وہ جس وقت چاہے اور جس لاش سے چاہے بات کر سکتی ہے۔ نجومی پانڈو نے کہا۔ "میرے جادو کے منتر نے لاش میں بھی جان پیدا کر دی تھی۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ میرے ساتھ رہو گی تو ساری زندگی عیش کرو گی۔"

جولی سانگ نے کہا۔ "میں نے کب کہا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"

نجومی پانڈو قبر پر آخری پتھر رکھتے ہوئے بولا۔ "ارے میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا۔ چلو اب چل کر خزانہ نکالتے ہیں۔"

وہ قلعے کے پیچھے جو اصطبل کا کھنڈر تھا اس طرف چل پڑے۔ جولی سانگ کہنے لگی۔ "پانڈو! کیا سچ مچ وہاں خزانہ دفن ہوگا؟ مجھے تو لاش کی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔"

نجومی پانڈو بولا۔ "لاش جھوٹ نہیں بولتی۔"

قلعے کے کھنڈر کے پیچھے واقعی ایک اصطبل کا کھنڈر تھا۔ اس کی ایک دیوار بھی تھی اور دیوار کے پاس زمین پر ایک گول پتھر بھی باہر کو نکلا ہوا تھا۔ نجومی پانڈو اس پتھر کو دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ "دیکھا، میں نے کہا تھا کہ لاش کبھی جھوٹ نہیں بولا کرتی۔ اس کے نیچے یقیناً "خزانہ" ہوگا میں اس پتھر کو ہٹاتا ہوں۔"

پانڈو نجومی نے کدال کی مدد سے پتھر کو کھود کر پرے ہٹا دیا۔ اس کے نیچے خالی زمین تھی۔ جولی سانگ نے ہنس کر کہا۔ "اب بتاؤ خزانہ کہاں ہے؟" پانڈو نجومی بولا۔

"خزانہ اس جگہ زمین کے اندر ہے۔"

اور نجومی نے کدال چلانی شروع کر دی۔ وہ مٹی باہر نکالتا جا رہا تھا۔ جولی سانگ اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ زمین میں تین فٹ گہرا گڑھا بن گیا تھا۔ نجومی پانڈو گڑھے میں اتر کر زمین کھودنے لگا۔ جب گڑھا پانچ فٹ گہرا ہو گیا تو اچانک کدال کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ نجومی پانڈو کے پسینے بھرے چہرے پر کامیابی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا۔ "جولی سانگ خزانہ مل گیا۔" جولی سانگ نے چونک کر کہا۔

"یہ تم نے میرا وہ نام کیوں لیا جو لاش نے بھی لیا تھا۔" تب نجومی پانڈو کو احساس ہوا کہ اس نے جوش میں آ کر جولی سانگ کا اصلی نام لے لیا تھا۔ جلدی سے بولا۔

"جولی سانگ اصل میں اس رانی کا نام تھا جس کا یہ خزانہ ہے۔ لاش نے بھی اس رانی کو یاد کیا تھا۔ یہ دیکھو شانتا! یہ دیکھو! زمین میں صندوق دبا ہوا ہے۔"

جولی سانگ گڑھے کے کنارے پر بیٹھ کر نیچے دیکھنے لگی۔ واقعی زمین میں سے لوہے کے صندوق کا ڈھکنا نظر آنے لگا تھا جس پر زنگ جم چکا تھا۔ پانڈو نجومی کدال کی مدد سے صندوق کے اردگرد سے مٹی باہر پھینک رہا تھا۔ جولی سانگ بولی۔ "پانڈو! اب جلدی سے اسے کھولو۔ دیکھوتو اس کے اندر کیا ہے۔"

نجومی پانڈو نے کدال کی مدد سے صندوق کا ڈھکنا ہٹا دیا۔ جولی سانگ اور پانڈو کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ صندوق قیمتی ہیرے موتیوں اور سونے کے زیورات سے بھرا ہوا جگ مگ، جگ مگ کر رہا تھا۔

جولی سانگ بولی۔ "پانڈو! یہ سارا خزانہ ہم کیسے اپنے گھر لے جائیں گے۔ کسی کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا؟"

پانڈو نجومی نے خزانے کے ہیرے جواہرات اور سونے کے زیورات اور ہاروں کو ہاتھوں پر اٹھا کر دیکھ رہا تھا اور بے حد خوش ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم فکر کیوں کرتی ہو۔ ہم تھوڑا تھوڑا کر کے خزانہ یہاں سے لے جائیں گے۔ صندوق اسی جگہ دبا رہے گا۔"

پانڈو نجومی اسی وقت باہر نکل کر ایک بڑا تھیلا گھوڑے کی پیٹھ سے نکال کر لایا اور اس میں ہیرے موتی اور زیورات بھر لیے۔ پھر خزانے کا ڈھکن بند کر کے گڑھے میں پتھر اور مٹی ڈالنے لگا۔

گڑھے کو بھر دینے کے بعد نجومی پانڈو نے وہاں اسی طرح گول پتھر رکھ دیا اور بولا۔ "اب میں دوبارہ یہاں آؤں گا اور سارا خزانہ نکال کر لے جاؤں گا۔"

جولی سانگ کہنے لگی۔ "پانڈو! تم چاہے کچھ کہو۔ مجھے ڈر ہے کہ شہر میں لوگوں کو پتا چل جائے گا کہ ہم نے کہیں سے خزانہ نکالا ہے۔ راجہ کو بھی علم ہو جائے گا، اور وہ ہم سے سارا خزانہ لے لے گا۔"

پانڈو نجومی بولا۔ "شانتا! ہم اب واپس اپنے شہر وارانا سی نہیں جائیں گے۔" جولی سانگ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا ہم اپنی حویلی چھوڑ دیں گے پانڈو؟"

"ہاں شانتا۔" پانڈو نجومی نے جواہرات وغیرہ سے بھرا ہوا تھیلا گھوڑے کی پیٹھ پر لاد کر اوپر موم جامہ ڈال دیا۔

جولی سانگ بولی۔ "تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟"

اب نجومی پانڈو نے اسے بتایا۔ "ہم اس ملک ہندوستان کو چھوڑ کر ملک بابل کے کسی شہر میں جا کر آباد ہو جائیں گے۔ ہم وہاں اپنا ایک عالی شان محل بنائیں گے اور باقی ساری زندگی عیش و آرام سے گزاریں گے۔ ہم یہ خزانہ بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

جولی سانگ نے پوچھا۔ "کیا ہم ملک بابل تک قافلے کے ساتھ پیدل سفر کریں گے؟"

نجومی پانڈو بولا۔ "نہیں، ہم سمندری جہاز میں بیٹھ کر سفر کریں گے۔ تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شانتا۔ میں نے سب کچھ پہلے ہی سے سوچ رکھا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" جولی سانگ نے سوال کیا۔

نجومی پانڈو بولا۔ "ہم ہندوستان کی مغربی بندرگاہ کالی کٹ جا رہے ہیں۔ وہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ ہم وہاں سے سمندری جہاز پکڑیں گے۔" جولی سانگ نے کچھ سوچ کر کہا۔ "پانڈو! میری بات مانو۔ اسی وقت سارا خزانہ اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔ کوئی پتا نہیں جب دوبارہ واپس آؤ تو خزانہ غائب ہو؟"

پانڈو بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس راز سے تو سوائے ہمارے اور کوئی واقف نہیں۔"

جولی سانگ کہنے لگی۔ "میں نے اپنی دادی سے سن رکھا ہے کہ جب تک خزانہ زمین میں دبا رہتا ہے وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا لیکن جب ایک بار اسے کھول دیا جاتا ہے تو خزانہ زمین کے اندر چلنے لگتا ہے اور اگر اسے ایک ہی دن میں نکال نہ لیا جائے تو وہ زمین کے اندر ہی اندر سفر کرتے ہوئے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔"

یہ سن کر نجومی پانڈو تو پریشان ہو گیا۔ جولی سانگ کی بات اس کے دل کو لگی تھی۔ کہنے لگا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو شانتا! ہم اسی وقت سارا خزانہ اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔ ہمارے پاس دو گھوڑے تو موجود ہی ہیں۔ ہم ان پر خزانے کا صندوق لاد لیتے ہیں۔"

اسی وقت نجومی پانڈو نے پتھر ہٹا کر گڑھے میں سے مٹی اور پتھر باہر نکالے اور پھر رسی باندھ کر خزانے کے صندوق کو بھی گڑھے سے باہر نکال لیا۔ یہ صندوق زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کو ایک بورے میں ڈال کر بورے کا منہ رسی سے باندھ دیا گیا۔ پھر اس خزانے کے صندوق والے بورے کو ایک گھوڑے کی پیٹھ پر لاد کر اوپر لکڑیاں اور درخت کی شاخیں ڈال کر انہیں کس کر باندھ دیا گیا۔ جولی سانگ نے کہا۔ "اب کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم کوئی خزانہ لے کر جا رہے ہیں۔"

پانڈو نجومی نے تھیلے میں جو جواہرات وغیرہ نکالے تھے وہ بھی خزانے کے صندوق میں ہی ڈال دیئے تھے۔ نجومی پانڈو کے پاس سونے کی ایک ہزار مہریں تھیں جو انہیں بحری جہاز کے ذریعے ملک بابل تک پہنچانے کے لیے بہت زیادہ تھیں۔ وہ دونوں گھوڑوں پر بیٹھ گئے۔ خزانے کے صندوق والا گھوڑا انہوں نے اپنے درمیان میں کر رکھا تھا۔ چوتھے گھوڑے پر کھانے پینے کی چیزیں اور کمبل وغیرہ لدے ہوئے تھے اور وہ ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ پانڈو نجومی نے اپنے پاس دو خنجر اور ایک تلوار اور تیر کمان بھی رکھ لیے تھے کہ راستے میں اگر کوئی خطرہ ہو تو اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ ان کا رُخ کالی کٹ بندرگاہ کی طرف تھا۔ جولی سانگ بھی بڑی خوش تھی کہ اسے اتنا بڑا خزانہ مل گیا ہے اور اب وہ باقی زندگی کسی دوسرے ملک جا کر عیش و آرام سے بسر کرے گی۔ جنگل میں چلتے چلتے رات ہو گئی۔ وہ ایک جگہ گھوڑوں سے اُتر پڑے۔ گھوڑوں کو درخت سے باندھ دیا گیا۔ یہاں انہوں نے تھوڑا بہت کھانا کھایا اور کمبل بچھا کر لیٹ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ اچانک انہیں سانپ کی پھنکار کی آواز سنائی دی۔ جولی سانگ ڈر کر اُٹھ بیٹھی اور بولی۔ "سانپ!" ☆☆☆

تیزی سے

(ایمان زہرہ، لاہور)

حرا نے تیزی سے دائیں اور بائیں سلام پھیرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور تیزی سے دعا مانگنے لگی۔ پھرتی سے مصلّے کو تہہ کیا، تپائی پر رکھا اور اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ قریب ہی تخت پر بیٹھی عافیہ بیگم نے یہ سب بغور دیکھا تھا۔ انہیں حرا کی نماز نے حیرت کے سمندر میں ڈال دیا تھا۔ عافیہ بیگم ایک پرہیزگار اور متقی خاتون تھیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے دونوں بچے حرا اور سلمان بھی پنج وقتہ نمازی تھے۔ بڑوں کا ادب کرتے اور ہر کسی کی عزت کرتے تھے لیکن گزشتہ چند روز سے وہ محسوس کر رہی تھیں کہ حرا کی نماز میں غیر معمولی تیزی آ گئی ہے۔

آج ایک روشن دن تھا۔ چھٹی ہونے کی وجہ سے عافیہ بیگم نے جلد ہی سارے کام نبٹا لیے تھے اور اب وہ تخت پر بیٹھی دوپہر کے کھانے کے لیے مٹر چھیل رہی تھیں کہ حرا کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے چہرے پر بارہ بجے تھے۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے مٹر کی ٹوکری ایک طرف رکھتے ہوئے حرا سے پوچھا تھا۔

''کیا بتاؤں امی، آج اتوار تھا تو میں نے سوچا کہ آج شازی سے بات کروں گی۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہم دونوں نے بات ہی نہیں کی۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی تو عافیہ بیگم نے پوچھا۔

''تو کر لی بات؟''

''جی امی جان! کر تو لی مگر سلام دعا اور رسمی سا علیک سلیک کرنے کے بعد ہی محترمہ کو فون رکھنے کی پڑ گئی۔ حد ہے بہترین سہیلی ہونے کا دم بھی بھرتی ہے اور بات کرنے سے جان بھی جاتی ہے۔'' وہ گویا بھری بیٹھی تھی، ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

''بس اتنی سی بات؟'' عافیہ بیگم مسکرائی تھیں۔

''امی یہ اتنی سی بات ہے۔'' اس نے 'اتنی' پر زور دیتے ہوئے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''اگر یہ اتنی بات نہیں ہے، تو میری جان آپ خود بھی تو اس اتنی سی بات کو دن میں پانچ بار دہراتی ہیں۔'' انہوں نے نرمی سے کہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' حرا نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔

''میرا مطلب یہ ہے بیٹا کہ شازیہ نے آپ سے جلدی بات کی اور فون رکھ دیا تو آپ کو بُرا لگا، جب آپ دن میں پانچ دفعہ نماز میں تیزی دکھاتی ہیں تو اللہ کو بُرا نہیں لگے گا؟ اللہ ناراض نہیں ہوں گے؟ نماز میں ہم اپنے رب سے ہم کلام ہوتے ہیں ناں، تب تو ہم تیزی دکھا لیتے ہیں۔ پھر جب کوئی دوسرا ہم سے تیزی سے بات کرے تو ہمیں بُرا کیوں لگتا ہے۔ بیٹا! ہم نماز پڑھ کر اللہ پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ نماز ہم اپنے لیے پڑھتے ہیں۔ اللہ کو تو ہماری نمازوں سے فائدہ نہیں پہنچتا، ہمیں خود پہنچتا ہے۔'' عافیہ بیگم نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''امی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔'' حرا نے شرمندگی سے کہا۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ نماز کو ٹھہر ٹھہر کر اور سکون سے ادا کروں گی۔'' عافیہ بیگم نے اس کے پُرعزم چہرے کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھا۔ اتنے میں مسجد سے اذان کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ حرا نے ایک نئے عزم کے ساتھ وضو کے لیے قدم بڑھا دیئے۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

چھوٹا کمرا

(محمد رمیز بٹ، لاہور)

آصف بیگ اپنا چہرہ ہاتھوں میں تھامے، کہنیاں میز پر ٹکائے ماضی کے دھندلکوں میں گم تھے۔ ان کے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی اور انہیں وہ وقت یاد آ رہا تھا جب ان کی اپنی شادی ہونے والی تھی۔ ان کے والدین بہت خوش تھے، مگر گھر صرف تین کمروں پر مشتمل تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ دلہا یعنی آصف کو کون سا کمرا دیا جائے۔ ایک کمرے میں آصف کے والدین سوتے تھے جب کہ دوسرے کمرے میں آصف کے دادا طاہر بیگ اور آصف سوتے

تھے۔ تیسرا کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا جو اسٹور کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ آصف کے والد واصف بیگ کا کہنا تھا کہ اب اباجی کو اسی کمرے میں منتقل ہو جانا چاہیے جب کہ دادا یہ چاہتے تھے کہ اسٹور والے کمرے کو خالی کرا کے آصف کو دے دیا جائے کیوں کہ انہیں دمے کا مرض تھا اور یوں بھی انہیں اپنے کمرے سے انسیت سی تھی۔ آصف کے دادا کا کہنا بے جا نہ تھا مگر ان کے احساسات کا ان کے بیٹے واصف کو اندازہ نہیں تھا اور وہ اپنے والد سے صاف صاف کہہ چکے تھے کہ انہیں چھوٹے کمرے میں سونا ہوگا۔ مجبوراً دادا کو اپنا کمرہ خالی کرنا پڑا۔ آصف کی شادی ہو گئی۔ سارا معاملہ ٹھیک لگ رہا تھا مگر طاہر بیگ اندر ہی اندر کڑھ رہے تھے۔ ان سب باتوں کا آصف کو احساس تھا مگر وہ چند منٹ دادا کے پاس بیٹھ کر ان کی دل جوئی کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ابھی آصف کی شادی کو تین مہینے ہی گزرے تھے کہ اس کے دادا وفات پا گئے۔ آصف کو جانے کیوں ایک پچھتاوا سا تھا۔

پچیس سال بعد اب خود آصف بیگ کے بیٹے ریحان کی شادی ہونے والی تھی اور اس کے ساتھ بھی وہی چھوٹے گھر کا مسئلہ تھا۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا ریحان اپنے دادا واصف بیگ کے ساتھ سوتا تھا۔ ریحان کے لیے کمرے کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔ آصف بیگ سوچ رہے تھے کہ کیا جس طرح ان کے والد نے طاہر بیگ کو کمرہ خالی کرنے کا کہا تھا تو کیا اسی طرح وہ بھی اپنے والد سے کمرا خالی کرنے کو کہیں؟ اس چھوٹے سے کمرے کو وائٹ واش وغیرہ کرا کر صاف ستھرا کیا جا چکا تھا۔ واصف بیگ سمجھ چکے تھے کہ اب ان سے کمرا خالی کرنے کو کہا جائے گا۔ انہوں نے خود ہی اپنا چھوٹا چھوٹا سامان اٹیچی میں رکھا اور اپنی کتابیں ایک ڈبے میں رکھنے لگے۔

ابھی وہ مغرب کی نماز پڑھ کر آئے ہی تھے کہ آصف بیگ آ گئے۔ اور کہنے لگے: ''ابو جی! آپ کو تو معلوم ہے کہ گھر میں جگہ......'' ابھی آصف بیگ نے اتنا ہی کہا تھا کہ واصف بیگ سمجھ گئے کہ ان سے کمرا خالی کرنے کو کہا جائے گا۔ ان کا جی چاہا کہ چلا چلا کر بیٹے سے کہیں کہ یہاں سے چلے جاؤ، یہ میرا کمرہ ہے مگر کسی طاقت نے ان کی زبان بند کر دی۔

آصف بیگ احترام سے ان کا ہاتھ تھام کر بولے: ''ریحان کی شادی میں اس کے ماموں بھی آ رہے ہیں۔ میں نے اپنا کمرا ریحان کے لیے خالی کر دیا ہے۔ چھوٹے کمرے میں اتنی گنجائش نہیں کہ میں اپنے ساتھ کسی کو ٹھہرا سکوں۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنے ساتھ انہیں بھی ٹھہرا لیں۔ صرف تین چار دن کی بات ہے۔''

آصف بیگ بولے جا رہے تھے اور واصف بیگ کے اندر ابلتا ہوا لاوا ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ انہیں لگا کہ جیسے کسی سفر میں وہ اپنے سعادت مند بیٹے سے بہت پیچھے رہ گئے ہوں۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

انتظار

(مدیحہ ادریس مغل، قلعہ دیدار سنگھ)

وہ سنہرے سورج کی چمکتی روشنی کو دیکھ رہی تھی جو اب ماند پڑ گئی تھی اور کوسوں دور جلتے الاؤ اس کی پریشانی میں مسلسل اضافہ کر رہے تھے۔ آگ کی بلندی کے ساتھ ساتھ اس کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے آج کتنی زندگیوں کے چراغ گل ہوئے ہوں گے، جانے صبح آزادی کب طلوع ہوگی؟

عائشہ کا تعلق مقبوضہ کشمیر کے ایک حریت پسند گھرانے سے تھا۔ اس کے والد عبدالرحیم تحریک آزادی کے سرکردہ رکن تھے اور اس کے بھائی بھی جذبہ شہادت سے سرشار اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ عائشہ نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے ارد گرد گولیوں کی آواز اور خوف و ہراس ہی دیکھا تھا۔ کبھی کبھار چند بھارتی فوجی آتے جو گاؤں کے سب لوگوں کو میدان میں اکٹھا کر لیتے اور جسے دل چاہتا مارتے۔ ایک دفعہ انہوں نے عائشہ کے بھائی حسن کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا لیکن تب وہ اس ظلم سے بے خبر تھی۔ اس کی اپنی ایک دُنیا تھی جہاں وہ گڑیا سے کھیلتے ہوئے خود کو دُنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کیا کرتی تھی۔ پھر پتا ہی نہ چلا کب خوشیوں نے اس سے منہ موڑا۔ وہ دن آج بھی اس کی یادداشت میں محفوظ تھا جب اس کے ننھے منے ہاتھوں سے گڑیا چھین لی گئی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ گڑیا لیے فاطمہ کے گھر جا رہی تھی کہ دو بھارتی فوجیوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ایک نے اس کے ہاتھ سے گڑیا چھین کر دُور پھینک دی تھی۔ عائشہ غصے سے ان

کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی گڑیا اُٹھانے کو دوڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ گڑیا تک پہنچتی ایک فوجی نے پستول کا بٹ عائشہ کی کمر میں مارا اور قہقہے لگاتے ہوئے چلا گیا۔ درد کی ایک لہر اسے کمر سے اُٹھتی محسوس ہوئی اور پھر پورے جسم میں سرایت کرتی چلی گئی۔ اس کے گھر والے فوراً ہی اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ اس کی امی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ عائشہ کے معصوم ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ میرا جرم کیا ہے؟ کس گناہ کی پاداش میں مجھے اذیت میں دھکیلا گیا۔ پھر ادراک کے کئی در وا ہونے لگے۔ ان چند لمحات میں اس نے سالوں کا سفر طے کر لیا۔ اسے اپنا قصور سمجھ آ گیا تھا۔ اس کا جرم یہی تھا کہ وہ مسلمان تھی۔ اس کی غلطی یہی تھی کہ اس کا تعلق آزادی کے پروانوں سے تھا۔ پھر ماہ و سال کی گردش میں اس نے ایسے اَن گنت واقعات دیکھے۔ اپنے بھائی کی مسخ شدہ لاش آج بھی اس کے تو تصور میں واضح تھی۔

گلی میں نعروں کی آواز اسے تلخ ماضی سے حال کی اذیتوں میں کھینچ لائی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کا قافلہ تھا جو ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے نعرے بلند کرتا ہوا دوسری گلی میں جا رہا تھا۔ اچانک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ اسے معلوم تھا کہ بھارتی فوجیوں نے ان ننھے مجاہدوں پر کتنی گولیاں برسائی ہوں گی اور کتنے پھول مرجھا گئے ہوں گے۔ عائشہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی چمک تھی۔ اسے فخر تھا کہ آزادی کے اس کارواں میں کشمیر کا بچہ بچہ شامل ہو چکا ہے اور وہ دن دُور نہیں جب کشمیر کے اُفق پر آزادی کا سورج طلوع ہو گا۔ اسے یقین تھا کہ ان کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ اب اسے اس دن کا انتظار ہے جب وہ وطنِ عزیز پاکستان کا حصہ بن جائے گی۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

عبرت ناک انجام

(اقراء یعقوب، قصور)

حامد ایک شرارتی لڑکا تھا۔ محلے کے تمام لوگ اس کی شرارتوں سے تنگ تھے۔ وہ آئے دن کوئی نہ کوئی نئی شرارت سوچتا۔ پرندوں کے گھونسلے اُجھاڑنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ نہ جانے کتنے پرندوں کے گھونسلے اس کے ہاتھوں برباد ہو چکے تھے۔ حامد کے والدین اکثر اسے سمجھاتے کہ بیٹا پرندوں کو تنگ کرنا اچھی بات نہیں، مگر حامد پر کوئی اثر نہ ہوتا بلکہ وہ اُلٹا ان سے بدتمیزی سے پیش آتا اور کہتا کہ بچپن میں ہر کوئی شرارتیں کرتا ہے۔ اگر میں کوئی چھوٹی موٹی شرارت کرتا ہوں تو نہ صرف آپ بلکہ پورے محلے والے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

اس کے والد نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا کہ ہم کب کہتے ہیں کہ کوئی شرارت نہ کرو بلکہ ایسی جس سے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک دن حامد درخت پر چڑیا کے گھونسلے سے انڈے نکالنے کے لیے اوپر چڑھا کہ اس کا پاؤں پھسلا اور حامد دھڑام سے نیچے گرا۔ حامد بہت زخمی ہوا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کے والدین اس کو اسپتال لے گئے جہاں اس کی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھایا گیا۔ کچھ دن سخت تکلیف میں گزرنے کے بعد کچھ آرام ہوا۔ بیڈ پر لیٹے لیٹے نئی شرارت سوچنے لگا کہ اتنے میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے دیکھا کہ قیامت کا دن تھا، نفسا نفسی کا عالم ہے۔ ہر کوئی اپنے گناہوں تلے دبے جا رہے ہیں۔ اسی اثناء میں حامد کا دم گھٹنے لگا۔ کسی نے بھی حامد کی طرف توجہ نہ دی۔ پھر حامد نے اپنے خوف ناک انجام سے کانپنے لگا۔ اسے اپنی تمام شرارتیں یاد آنے لگی۔ پھر اس کے کانوں میں پرندوں کی آوازیں گونجنے لگیں جو اس کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ یکا یک کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا، ایک طرف گھسیٹا۔ اس نے دیکھا سامنے آگ جل رہی ہے اور آگ کے شعلے اس کی طرف لپک رہے ہیں۔ وہ زور زور سے چلّانے لگا۔ ''میں دوزخ میں نہیں جاؤں گا۔ میری توبہ میں آئندہ کسی کو تنگ نہیں کروں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔'' اس کے پاس بیٹھی اس کی ماں نے اس کو سہارا دیا اور پوچھا۔

''بیٹا! کیا کوئی خواب دیکھا ہے۔'' حامد نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اپنا عبرت ناک انجام کا بتایا۔ حامد نے اس دن سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ کسی کو تنگ نہیں کرے گا بلکہ مصیبت زدہ کی مدد کرے گا اور مظلوموں کی حمایت کرے گا۔

پیارے بچو! آپ بھی تکلیف دہ شرارتوں کی بجائے دکھی انسانوں کی خدمت کو شعار بنائیں۔ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہمیشہ خوش ہوتا ہے۔ انہیں اس کا اجر بھی دیتا ہے۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

روشن ستارہ

(ثمرہ احمد، سیالکوٹ)

ستارے روشن انسانوں، باکردار لوگوں، محبت اور خلوص میں ڈھلے کرداروں اور خوب صورت چیزوں کی صورت میں صرف آسمان پر ہی نہیں، زمین پر بھی چمکتے ہیں۔

جی ہاں، پیارے بچو! یہ کہانی آپ کے لیے زندگی میں مشعل راہ ہے کیوں کہ جس ستارے کی یہ کہانی ہے، وہ بھی آپ کی طرح پہلے ننھا سا پودا تھا لیکن پھل پھول کر جب ایک تن آور درخت بنا تو خوب پھل دار ہوا اور آسمان پہ چمکنے والے ستاروں میں سب سے زیادہ روشن ستارہ بن کر زمین پہ ایسا چمکا کہ اندھیروں میں بھی روشنی ہوگئی۔

لو جی، اب پڑھو کہانی! ایک تھا بچہ بہت ہی پیارا، سچا اور اچھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں رحیم بخش دادا جی اور عالم بی بی دادی جی کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا تھا۔ اپنے ابو جی حمید صاحب کے ساتھ ان کے دفتر چلا جاتا اور پڑھتا رہتا۔ وہ ڈاک خانے میں بڑے افسر تھے۔ اسے اپنے ابو جی کی ہر بات سے بہت محبت تھی۔

اس کے آئیڈیل اس کے دادا جی تھے جو بہت جفاکش، محنتی، مخلص اور ایمان دار ٹھیکیدار تھے لیکن انہوں نے اپنے تمام بیٹوں پر بہت محنت کرنے کے بعد انہیں افسر بنایا تھا۔ عمران ان کا بڑے سے چھوٹے والا لاڈلا پوتا تھا۔ نوعمری ہی میں اس کی ذہانت کا ڈنکہ بجنے لگا۔ والد نے اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اپنے بیٹے کو ورثے میں دے ڈالیں کیوں کہ حمید صاحب خود بھی قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے انہوں نے پیش گوئی کی تھی کہ عمران بہت پڑھے لکھے گا اور ان شاء اللہ ایک بڑا آدمی بنے گا۔ ابھی وہ چار سال کی عمر میں تھا کہ اخبار پڑھنے کے قابل ہوگیا تھا اور تقریباً چھ سال کی عمر میں پہنچتے پہنچتے سیال کوٹ محلہ کشمیری مسجد نور میں رمضان کے مقدس مہینے میں ستائیس دن کے اندر اندر مکمل قرآن پاک پڑھ چکا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پہلا سپارہ اس نے حافظ صاحب کو پہلے روزے سنایا اور قاری صاحب نے خوش ہوکر اس سے روزانہ سبق سننا شروع کیا تو 27 رمضان کی بابرکت شب عمران پورا قرآن پاک ایک مہینے میں پڑھ چکا تھا۔ الحمدللہ دین سے اتنی لگن اور اسکول میں پڑھائی کی رفتار دیکھیے، انگریزی کے مضمون میں مکمل نمبر لیتا۔ حساب، سائنس ہر مضمون پر اس کی گرفت ہمیشہ مضبوط سے مضبوط رہی۔ اس کے والد محترم کی محنت رنگ لا رہی تھی لیکن اللہ کی قدرت دیکھیے کہ چھوٹی عمر میں ہی عمران کو حمید صاحب کی پدری شفقت سے محروم ہونا پڑا۔ کٹھن گھڑی آ گئی، حمید صاحب اس دارفانی سے 1977ء میں کوچ کر گئے اور عمران زندگی کے مصائب اور جھمیلوں میں یتیم ہوکر طوفانوں کے بیچ تن تنہا کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت باہمت اور بلند سوچوں کا حامل بچہ تھا۔ اس نے مصائب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیں اور اپنی پڑھائی پر توجہ دی۔ سائنس کے ساتھ میٹرک میں فسٹ ڈویژن لے کر انتہائی اچھے نمبروں کے ساتھ مرے کالج سیال کوٹ میں داخل ہوا۔ یہاں سے نکلا تو کاکول ایبٹ آباد کالج میں چلا گیا۔ والدین اور دادا جی کی بے لوث دعائیں ثمر آور ہوئیں ننھا عمران لیفٹیننٹ سے کیپٹن بن گیا اور جب وہ ٹرانسفر ہوکر گوجرانوالہ کینٹ آیا تو وہیں پر ڈیورنگ آرمی فلائنگ کورس کرنے لگا۔ امتحان پاس کرنے کے بعد وہ فلائنگ آفیسر بن گیا اور انسٹرکٹر کے عہدے پر آ گیا۔ وقت کا پہیہ بہت تیزی سے گھومنے لگا، یہ روشن ستارہ اپنی محنت کے بل بوتے پر اللہ کے کرم سے مزید ترقی حاصل کرنے لگا جسے میجر عمران کا نام ملا۔ میجر عمران نے اس کے بعد سول فلائنگ کے شعبے کو اپنے لیے منتخب کیا۔ ملک وقوم کی ترقی میں اہم کردار ادا کرنا شروع کیا۔ سیالکوٹ انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی تعمیر کے بعد یہ عمران نامی روشن ستارہ اقبال کا شاہین بن کر اقبال کے شہر کے ائیرپورٹ پر اپنا جہاز لے کر اُترا۔ عزیز واقارب کے لیے فخر اور اپنے والدین کے لیے رشک کا باعث بنا۔ اس نے کام یابیوں کا سفر طے کیا۔ مسلسل جدوجہد، لگن، ہمت وحوصلے کو اپنا رفیق بنایا اور نکھر کر روشنی کی صورت میں زمین پر اُبھرا۔ یہ روشن ستارہ اب ایک ائیر لائن میں اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ خدا کرے یہ روشن ستارہ زندگی کے اُفق پر یوں ہی چمکتا دمکتا رہے اور اپنی روشنیاں بکھیرتا رہے، آمین! پیارے بچو! آپ لوگ بھی اپنی زندگی کے مقاصد کو عمران کی طرح پورا کریں اور ملک وملت کا پرچم یوں ہی بلند کرو جیسے عمران نے بلند کیا جسے دُنیا آج فلائنگ میں کیپٹن عمران کے نام سے جانتی ہے۔

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

☆☆☆

اس دُنیا میں جتنے بھی رشتے ہیں، ان سب رشتوں کی محبت ایک طرف اور ماں کی ممتا ایک طرف۔ ماں ایک ایسی چھاؤں ہے جس کی موجودگی میں اولاد کو کوئی پریشانی و دکھ چھو بھی نہیں سکتا۔ ماں ہی وہ واحد ہستی ہے جو صرف دینا جانتی ہے اور بدلے میں کچھ نہیں مانگتی۔

ماں کی محبت و چاہت کا صحیح اندازہ بھی شاید اس کی زندگی میں نہیں ہو پاتا۔ میری والدہ 24 دسمبر 2014ء کو اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس بڑھا کہ وہ ہمارے لیے کیا تھیں؟ ان کے جانے کے دو ماہ بعد جب ایک شام میں نے ''امی، امی'' پکارا، مگر میری یہ پکار کسی نے نہیں سنی۔ ماں ہوتی تو سنتی۔ پھر خود ہی کمرے میں بیٹھ کر روتا رہا۔ ماں جیسا بے لوث و بے غرض رشتہ کوئی نہیں، ماں کی محبت کا دُنیا میں کوئی بدل نہیں۔ شاعر نے اسی بات کو کچھ یوں لکھا ہے۔

سب نے اپنے اپنے تحفے بانٹ لیے
حال سفر کا میری ماں نے پوچھا تھا

بچوں کے معروف ادیب، مرزا ادیب اپنی کتاب ''مٹی کا دیا'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ابا جی مجھے مارتے تو امی بچا لیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ اگر امی پٹائی کریں گی تو ابا جی بچا لیں گے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہوتا ہے، میں نے امی کا کہا نہ مانا۔ انہوں نے کہا کہ بازار سے دہی لا دو، میں نہ لایا۔ انہوں نے سالن کم دیا۔ میں نے زیادہ پر اصرار کیا۔ انہوں نے کہا کہ سیڑھی کے اوپر بیٹھو۔ میں نیچے بیٹھ گیا۔ کپڑے میلے ہو گئے۔ میرا لہجہ بھی گستاخانہ تھا۔ مجھے پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی، مگر انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ 'دلاور پتر! میں صدقے، تو بیمار تو نہیں ہوا' اس وقت میرے آنسو تھے کہ رکتے ہی نہیں تھے۔''

مائیں اپنے عمل و کردار سے اولاد کی ایسی تربیت کرتی ہیں کہ اس سے آنے والی کئی نسلیں فیض یاب ہوتی ہیں۔ ایسی مائیں تاریخ میں امر ہو جاتی ہیں۔ ماؤں کے عالمی دن کے حوالے سے اس مضمون میں ہم کچھ ایسی ہی ماؤں کا تذکرہ کریں گے۔

بی اماں...... علی برادران کی والدہ محترمہ:

مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کی والدہ محترمہ کا اصل نام آبادی بانو تھا، تاہم وہ بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان

کے شوہر رام پور کے ایک معزز اور بااثر شخصیت تھے۔ 28 برس کی عمر میں ہی شوہر کا انتقال ہو گیا۔ پھر انہوں نے جس بہادری، جرأت و ہمت سے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی، اسی کا نتیجہ ہے کہ علی برادران (محمد علی، شوکت علی) جیسے قابلِ فخر سپوتوں نے ملک و ملت کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ بی اماں ایک بہادر اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کے دونوں بیٹوں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کو 1921ء میں قید کیا گیا تو آپ نے یہ وقت بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا۔ دونوں بیٹے جب قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے تو یہ وقت ایک ماں کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ بی اماں علالت کے باوجود حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں گئیں اور مسلمانوں کا حوصلہ بلند کرتی رہیں۔ اقبال سہارن پوری ایک مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کی اسی زمانے میں ''صدائے خاتون'' کے نام سے لکھی گئی نظم ہندوستان بھر میں بہت مقبول ہوئی۔ اس نظم کا ایک شعر تھا۔

ء بولی اماں محمد علی کی جان بیٹا، خلافت پر دے دو

بی اماں جدوجہدِ آزادی کے لیے بہت متحرک رہیں اور 1924ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔

امام بی بی...... علامہ اقبالؒ کی والدہ محترمہ:

شاعرِ مشرق، مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کی والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ امام بی بی ایک نیک سیرت اور بلند کردار کی حامل خاتون تھیں۔ جب انہیں اپنے شوہر کی کمائی پہ شک ہوا تو انہوں نے اپنے زیورات فرخت کیے اور ایک بکری خرید لی۔ یوں علامہ اقبالؒ کی پرورش ماں کے دودھ کی بجائے بکری کے دودھ پر ہونے لگی۔ جب شوہر نے ان سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو امام بی بی نے فرمایا۔ ''آپ کا پیشہ مشکوک ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتی کہ اپنے بیٹے کی پرورش ناجائز آمدنی سے کروں۔ اس لیے بیٹے کو اپنا نہیں بلکہ بکری کا دودھ پلایا کروں گی۔'' یہ سلسلہ علامہ اقبالؒ کے والد کی ملازمت اور ذرائع آمدن کے حوالے سے تسلی بخش اطمینان کی فراہمی تک جاری رہا۔ یہ ایک ماں کی اپنے بیٹے کے لیے احتیاط پسندی ہی تھی کہ جس سے ان کا بیٹا شاعرِ مشرق بنا، حکیم الامت بنا اور سب سے بڑھ کر اس بچے کے دل میں اسلام اور نبی کریم ﷺ کی محبت کا سمندر موجود تھا۔ یہ سب امام بی بی کی تربیت اور بلند کرداری کا نتیجہ تھا کہ علامہ اقبالؒ مردِ درویش کہلایا۔

عزیز النساء...... سرسید احمد خاں کی والدہ محترمہ:

علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کی والدہ محترمہ کا نام عزیز النساء تھا۔ وہ بے حد ہمدرد اور نیک خاتون تھیں۔ انہوں نے بڑے اچھے اصولوں و اوصاف پر اپنے بیٹے کی تربیت کی۔ ان کی ذات کے حوالے سے یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ بچپن میں ایک دفعہ سرسید احمد خاں نے گھریلو ملازم کی کسی بات پر ناراض ہو کر اسے مارا۔ والدہ کو بیٹے کی اس حرکت کا پتا چلا تو اس سے نہ صرف ناراض ہوئیں بلکہ گھر سے بھی نکال دیا۔ سرسید ڈر کے مارے خالہ کے گھر چلے گئے اور واپسی کی ہمت نہ ہوئی۔ تین دن بعد خالہ جان کی سفارش لے کر اپنی والدہ کے پاس گئے تو انہوں نے کہا۔ ''جب تک ہاتھ جوڑ کر ملازم سے معافی نہیں مانگو گے، میں ہرگز معاف نہیں کروں گی اور نہ ہی گھر میں آنے دوں گی۔'' آخر سرسید نے ملازم سے معافی مانگی، تب جا کر ان کی والدہ نے معاف کیا۔ سرسید احمد خاں کی والدہ محترمہ اپنے ملازمین کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ملازم سے ہمدردی کا ہی ایک اور واقعہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ وہ بیمار ہو گئیں۔ اتفاق سے جس بیماری کا شکار تھیں، وہی ملازمہ کو بھی تھی۔ سرسید کی والدہ نے اپنے لیے جو دوا منگوائی، وہ بہت قیمتی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ملازمہ تو گھر کا خرچہ بمشکل چلاتی ہیں، اپنا علاج کیسے کروائے گی۔ چناں چہ انہوں نے اپنی دوا ملازمہ کو دے دی۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے ملازمہ بھی صحت یاب ہو گئی اور سرسید کی والدہ محترمہ بھی بغیر دوا کھائے صحت یاب ہو گئیں۔

یہ سرسید کی والدہ محترمہ کی تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے تاریخ میں وہ نمایاں مقام حاصل کیا، جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب کی ''ماں جی'':

معروف بیوروکریٹ اور ''شہاب نامہ'' کے مصنف قدرت اللہ شہاب کی والدہ ایک عام روایتی گھریلو ماں تھیں۔ قدرت اللہ شہاب نے اپنے افسانے ''ماں جی'' میں اپنی والدہ کا جو خاکہ تحریر کیا، اس نے ''ماں جی'' کے کردار کو امر کر دیا۔ قدرت اللہ شہاب نے اپنی ''ماں جی'' کی سادگی و سچائی جس انداز سے بیان کی، اس

کی اُردو ادب میں مثال کم کم ہی ملتی ہے۔ وہ اپنی والدہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ماں جی کا بچپن و جوانی نامساعد حالات میں گزری۔ اتنا بھی پاس نہ تھا کہ پیٹ بھر کر روٹی ہی کھا سکتے۔ کبھی جنگلی بیروں پر گزارا ہوتا تو کبھی خربوزے کے چھلکے اُبال کر کھا لیے جاتے۔ کبھی درخت سے گری آم کی کیریاں مل جاتیں تو ان کی چٹنی بنا لی جاتی۔ ان کے والد نے بڑی محنت سے ایک بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنایا تو پھر ان کے دن پھر گئے۔ پھر ماں جی کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ ان کے شوہر ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ وہ روزگار کے لیے گلگت گئے تو ان کی قابلیت کی وجہ سے انہیں وہاں کا گورنر بنا دیا گیا۔ ایک گورنر کی اہلیہ ہونے کے باوجود ماں جی نے زندگی سادگی سے ہی گزاری۔ ایک بار گورنر کی جانب سے وائسرائے ہند کو ضیافت دی گئی۔ اس ضیافت کے تمام کھانے ماں جی نے خود تیار کیے جو وائسرائے کو بہت پسند آئے۔ ضیافت کے بعد جب ان کے شوہر گھر پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی سے مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔''

مدر ٹریسا:

مدر ٹریسا انسانیت کی ماں تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی ناگفتہ بہ حالت کے شکار لوگوں کو بہتر زندگی دینے کی جدوجہد میں گزار دی۔ مدر ٹریسا 26 اگست 1910ء کو مقدونیہ کے دارالحکومت سکوبیہ میں پیدا ہوئیں۔ تاہم ان کے آباء و اجداد البانوی تھے۔ 12 برس کی عمر سے ہی انہوں نے انسانیت کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ ان کے خیال میں خدا نے انہیں اس کام کے لیے پیدا کیا ہے، چناں چہ 18 برس کی عمر میں انہوں نے والدین کو الوداع کہا اور بھارت میں قائم سسٹرز آف لوریٹو نامی آئرش راہباؤں کی جماعت میں شمولیت اختیار کی۔ 1948ء میں مدر ٹریسا نے کلکتہ کے سینٹ میریز ہائی اسکول میں تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس دوران انہوں نے محسوس کیا کہ اسکول کے آس پاس قائم جھونپڑیوں اور لوگوں کی حالت خاصی ناگفتہ بہ ہے اور ان کی حالت کی بہتری کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ چناں چہ 1948ء میں ہی انہیں اس بات کی اجازت مل گئی کہ وہ کانونٹ سے نکل کر کلکتہ کے غربت زدہ لوگوں کی فلاح کے لیے کام کریں۔ 1952ء میں انہوں نے محتاجوں کے لیے ''نرمل ہردیے'' کا آغاز کیا، جہاں بے سہارا اور بیمار افراد کی خدمت کی جاتی۔ جب وہ صحت یاب ہو جاتے تو انہیں کوئی نوکری دلوا دی جاتی، تاکہ وہ اپنی زندگی بغیر کسی تکلیف کے گزار سکیں۔ اپنے اس کام کو انہوں نے دُنیا کے مختلف علاقوں میں بھی فروغ دیا۔

مدر ٹریسا کی باقی زندگی غربت اور بیماریوں میں مبتلا سسکتے بلکتے انسانوں کی خدمت میں گزرا۔ 1979ء میں لاکھوں لوگوں کی خدمت اور ان سے محبت کے اعتراف پر انہیں ''نوبل پرائز'' سے نوازا گیا۔ 1997ء میں لاکھوں لوگوں کی زندگیوں کو بہتری دینے والی اس عظیم ہستی کا انتقال اسی کلکتہ شہر میں ہوا اور یہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ 2003ء میں کیتھولک مسیحوؤں کے روحانی پیشوا نے انہیں خصوصی مذہبی خطاب ''مبارکہ'' سے نوازا۔ ایک سروے کے مطابق بھارتی لوگ گاندھی کے بعد جس شخصیت کا سب سے زیادہ احترام کرتے ہیں، اس کا نام ''مدر ٹریسا'' ہے۔

بچوں کو ذیابیطس سے بچائیں

ہمارے معاشرے میں عام تصور یہ ہے کہ ذیابیطس صرف 40 سال سے زائد عمر کے افراد کو لاحق ہو سکتی ہے لیکن موجودہ دور میں یہ عارضہ بچوں کو بھی لاحق ہے۔ ذیابیطس کی دو اقسام میں سے ایک قسم ٹائپ ون کہلاتی ہے جو بچوں اور کم عمر کے افراد کو متاثر کرتی ہے۔ اس کی علامات میں وزن میں تیزی سے کمی، پیاس کی انتہائی شدت، خون اور پیشاب میں کیٹون (Ketone) نامی تیزابی مادے کی زیادتی ہے۔ اس میں بعض اوقات بچے قومے میں چلے جاتے ہیں۔ ٹائپ ٹو میں خوب بھوک لگتی ہے اور بچے کے وزن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ادویات کے ساتھ بچوں کا طرز زندگی بدلنے کی کوشش کریں یعنی زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کا عادی بنائیں۔ سیڑھیوں کا استعمال کریں آؤٹ ڈور گیمز کھیلیں۔ سوفٹ ڈرنکس اور جنک فوڈز کی بجائے گھر کے کھانے کھائے جائیں۔ کسی ماہر اغذائیہ سے غذائی چارٹ بنوائیں۔ بچے ورزش کریں اور موٹاپے سے بچائیں۔ اپنی عمر کے حساب سے آئیڈیل وزن حاصل کریں۔ بچوں کو بھرپور ناشتا کروائیں جس میں صحت مند غذا یعنی چپاتی، دلیہ، یا دو چمچ تیل کا پراٹھا زیادہ بہتر ہے۔ ناشتے میں بیکری کی اشیاء سے پرہیز کریں، یہاں تک کہ رس اور ڈبل روٹی سے بھی کیوں کہ یہ جلد ہضم ہو جاتے ہیں۔ آج کل بیکری کی اشیاء میں کیمیائی خمیر استعمال ہوتا ہے جو صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ بروسٹ اور ڈیپ فرائیڈ اشیاء سے پرہیز کریں۔ کمپیوٹر موبائل اور ٹیب کا استعمال کم سے کم کریں۔ کسی ماہر معالج مریض کے مکمل معائنے کے بعد درست ادویات تجویز کروائیں۔

نیٹ بال

نیٹ بال لڑکیوں کا کھیل ہے اور باسکٹ بال سے ملتا جلتا ہے۔ اس کھیل میں اگر کوئی کھلاڑی مخالف ٹیم کے رنگ (جسے گول کہتے ہیں) میں گیند ڈال دے تو اس کی ٹیم کو ایک پوائنٹ ملے گا۔ آخر میں جس ٹیم کے پوائنٹ زیادہ ہوں گے، وہ جیت جائے گی۔

اس کھیل میں 15.15 منٹ کے چار کوارٹر ہوتے ہیں۔ پہلے اور تیسرے کوارٹر کے بعد 5 منٹ کا بریک (وقفہ) ہوتا ہے اور ہاف ٹائم پر (یعنی 30 منٹ بعد) 10 منٹ کا بریک دیا جاتا ہے۔ ہر کوارٹر کے بعد ٹیمیں اپنی سائڈ بدل لیتی ہیں۔

ہر ٹیم میں سات سات لڑکیاں ہوتی ہیں، جن کی مندرجہ ذیل پوزیشنیں ہوتی ہیں: گول کیپر (GK)، گول ڈیفنس (GD)، ونگ ڈیفنس (WD)، سینٹر (C)، ونگ اٹیک (WA)، گول اٹیک (GA)، گول شوٹر (GS)۔ یہ انگریزی حروف کھلاڑیوں کی قمیصوں پر لکھے ہوتے ہیں۔ کھیل کی نگرانی دو امپائر کرتے ہیں۔ ایک امپائر کورٹ کے ایک ہاف کو کنٹرول کرتا ہے اور دوسرا دوسرے ہاف کو۔ گیند چمڑے یا ربڑ کی ہوتی ہے اور تقریباً فٹ بال کے برابر ہوتی ہے۔

اس کھیل کا کورٹ (گراؤنڈ) لکڑی یا کنکریٹ کا ہوتا ہے۔ ناہموار سطح یا گھاس کا میدان اس کے لیے موزوں نہیں۔ کورٹ کی لمبائی 100 فٹ اور چوڑائی 50 فٹ ہوتی ہے۔ اسے تین برابر حصوں (زون) میں تقسیم کیا جاتا ہے اور درمیان میں تین فٹ قطر کا دائرہ لگایا جاتا ہے۔

کورٹ کے دونوں طرف گول لائن کے درمیان گول پوسٹ (گول کے پول یا کھمبے) ہوتے ہیں۔ ہر پوسٹ یا پول میں زمین سے 10 فٹ اونچا 15 انچ قطر کا لوہے کا ایک رنگ ہوتا ہے۔ اس رنگ میں ایک جال (نیٹ) لگا ہوتا ہے جو اوپر نیچے سے کھلا ہوتا ہے۔ اسی نیٹ یا جال کو گول کہتے ہیں اور کھلاڑی اسی میں گیند ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ گول پوسٹوں کے سامنے 16 فٹ کا، نصف قطر کا، نصف دائرہ لگایا جاتا ہے، جسے شوٹنگ ایریا کہتے ہیں۔ صرف اسی ایریا سے گیند کو گول میں ڈالا جا سکتا ہے۔ باہر سے گول کیا جائے گا تو وہ گول نہیں مانا جائے گا۔ اس کھیل میں ہر کھلاڑی صرف اپنی پوزیشن پر کھیلتا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری پوزیشن پر کھیلے گا تو وہ فاؤل ہوگا۔

کھیل کے شروع میں سینٹر کا کھلاڑی دوسرے کھلاڑی کو پاس دیتا ہے۔ اس کھلاڑی کو (جسے پاس دیا گیا ہے) چاہیے کہ وہ تین سیکنڈ کے اندر اندر اگلے کھلاڑی کو پاس دے دے۔ اس طرح پاس کے ذریعے گیند گول شوٹر تک پہنچائی جاتی ہے، جو شوٹنگ ایریا میں سے گیند کو گول میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر ٹیم گول کرنے سے پہلے کم از کم دو کھلاڑیوں کو پاس دیتی ہے۔ کوئی کھلاڑی گیند لے کر دوڑ نہیں سکتا۔ وہ اپنے پاؤں پر گھوم کر دوسرے کھلاڑی کو پاس دیتا ہے۔ گیند سائڈ لائن یا گول لائن سے باہر چلی جائے تو مخالف ٹیم کا کھلاڑی اسی جگہ سے گراؤنڈ میں تھرو کرے گا جہاں سے گیند نے لائن پار کی تھی۔ انٹرویل (Interval) یا گول ہونے کے بعد کھیل سینٹر سے دوبارہ شروع کیا جائے گا۔

☆☆☆

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟
''تعلیم و تربیت'' میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور میں اسے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ پہلی بار آپ کی محفل میں اجازت کے بغیر شامل ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ خوش آمدید کہیں گے۔ اس ماہ کا رسالہ بہت زبردست تھا۔ سرورق چینی کہانی ''بڑھیا کا شوربا'' کی تصاویر سے جگمگا رہا تھا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح ہمارے لیے سبق لیے ہوا تھا۔ خط جلدی بھیجنا ہے اس لیے پورا رسالہ نہیں پڑھا ابھی۔ پُراسرار مچھلی بھی اچھی کہانی تھی اور اس میں مچھلی یقیناً اس نوجوان کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے بھیجی تھی۔ دل کش پاکستان میں عبدالحمید عابد نے ہمیں پورے پاکستان کی سیر ہی کرا ڈالی۔ اس کے لیے ان کا شکریہ۔ حمد و نعت، درسِ قرآن و حدیث بھی نہایت لاجواب تھے۔ آپ نے حوصلہ افزائی کی تو آئندہ بھی ضرور شامل ہوں گا۔
(عبدالرحمن رضا، خان بیلہ)

☆ پسندیدگی اور تعریف کرنے کا شکریہ۔

نہایت ادب و احترام کے ساتھ سلام قبول کیجیے۔ حال چال کیسے ہیں؟ تعلیم و تربیت ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے دماغی صلاحیتوں میں حرکت ہوتی ہے اور پھر حرکت سے برکت ہے۔ اس کی معلومات میرے دل و دماغ میں گھر کر لیتی ہیں۔ تعلیم و تربیت میرا مصاحب ہے۔ میری اور اس کی دوستی اب پرانی ہو چکی ہے لیکن یہ مری کے کسی بک اسٹال پر دستیاب نہیں ہوتا جس کے سبب میں انعامی سلسلوں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ مجھے تعلیم و تربیت کا شمارہ اگست 2015ء چاہیے، کیا آپ مجھے بھجوا سکتے ہیں کیوں کہ وہ اب ملتا نہیں۔ آپ پر سلامتی ہو۔
(اسامہ ظفر اسامہ، مری)

اُمید کرتی ہوں کہ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیریت سے ہو گی۔ تعلیم و تربیت کے تمام لکھاریوں کو رجب کا رحمتوں سے بھرا ہوا مہینہ بہت بہت مبارک ہو۔ آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ تعلیم و تربیت کی تاریخ نہیں بڑھاتے۔ پچھلے ماہ ہمیں یہ رسالہ نہیں ملا، اس لیے اس میں شمولیت نہیں کر پائے۔ اب آتے ہیں اس رسالے کی تعریف کی طرف تو سنیے اس ماہ کا رسالہ بھی زبردست تھا۔ خاص طور پر مختصر مختصر، 66 دن کا راز، عقل مند کسان اور آپ بھی لکھیے وغیرہ سپرہٹ تھی۔ ہمیں تو اس دفعہ اُمید ہی نہیں تھی کہ ہمیں یہ مل جائے گا۔ بس اب مہربانی کر کے ہمارا خط شائع کیجیے۔ پہلے ہی دو ماہ کے بعد ملا ہے۔ اگر اب آپ نے ہمارا خط شائع نہ کیا تو ہمارا دل ٹوٹ جائے گا۔

نہیں محتاج دُنیا کا اک تیرے سوا یا رب!
میرے سجدے قبول کر لے میری سانس ٹوٹنے سے پہلے

اللہ تعالیٰ آپ کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔ آمین!
(اُم کلثوم عبدالستار، مصدق صفدر خان، پتوکی)

اُمید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں دو سال سے تعلیم و تربیت کی قاری ہوں مگر خط لکھنے اور تعلیم و تربیت کے باقی سلسلوں میں حصہ لینے کی کوشش پہلی بار کی ہے اور اُمید کرتی ہوں کہ پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ یہ سب کچھ میں اپنے والدین سے چھپ کر کر رہی ہوں کیوں کہ میں چاہتی ہوں کہ اگلے شمارے میں جب میرا نام آئے تو میں انہیں سرپرائز دوں اور انہیں بہت خوش کروں۔ اس ماہ کے رسالے میں فرض کی ادائیگی، طارق بن زیاد، میرا الجھن ٹاپ پر تھیں۔ تعلیم و تربیت تمام بچوں کا من پسند رسالہ ہے اور میرے شہر میں تو یہ رسالہ بھی نایاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو ترقی و کامرانی عطا کرے اور آپ کو لمبی عمر عطا کرے۔ میرے خط کو ردی کی ٹوکری سے ڈر تو نہیں لگتا مگر پھر بھی خط شائع ضرور کیجیے گا۔ یہ التجا ہے، حکم نہیں۔ جواب کی منتظر ہوں۔

ڈرپوک ہیں وہ لوگ جو خط نہیں لکھتے
بڑا حوصلہ چاہیے ردی میں جانے کے لیے

(مومنہ مقصود، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

☆ ڈیئر مومنہ قلمی تعاون جاری رکھیے گا۔ آپ کے لیے بھی بہت سی دُعائیں۔

اس مہینے کا سرورق اور پورا تعلیم و تربیت بہت ہی خوبصورت تھا۔ آپ کھڑ کھانڈ گروپ کیوں نہیں شائع کرتیں۔ میں ہر دفعہ آپ کو خط بھیجتا ہوں مگر آپ میرا خط شامل نہیں کرتیں۔ مجھے بہت خوشی ہو گی اگر آپ میرا خط شائع کر دیں۔ اللہ آپ کا اور پوری تعلیم و تربیت کی ٹیم کا حامی و ناصر ہو۔ آمین!

تو صبح درخشاں تو باب سادگی
خدا کرے تجھے کبھی زوال نہ ہو

(انعام چوہان، کھاریاں)

☆ آپ اب خوش ہیں! دوسرے سلسلوں میں بھی حصہ لیجیے۔

میری طرف سے تعلیم و تربیت کی تمام ٹیم کو بہت سلام۔ میری مصوری کو بہت پسند کیا گیا۔ جن لوگوں نے بھی میری مصوری کو سراہا، ان کا بہت شکریہ۔ میں تین چار ماہ سے اس سلسلے میں حاضر نہیں ہوا کیونکہ میں نہم جماعت کے امتحان دے رہا تھا۔ اب میں ان سلسلوں میں حصہ لوں گا۔ کیا آپ مجھے خوش آمدید نہیں کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے تعلیم و تربیت دن دگنی رات چگنی ترقی کرے۔ ہم سب اس کے لیے دعا گو ہیں۔ میرا خط تقریباً سات سال سے کبھی شائع نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(محمد زبیر جمشید، جہانیاں)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

آپ کا رسالہ تو ہر بار ہی پہلے سے اچھا ہوتا ہے۔ آپ کو دوبارہ مبارک باد دیتی ہوں۔ آپ کی اتنی محنت کا صلہ ہمیں اس پیارے رسالے کی صورت میں ملا۔ 11 مئی کو میری سال گرہ ہے، مبارک باد ضرور دیں۔ اللہ ان تمام بچوں کو صبر و جمیل عطا کرے جن کی عظیم ہستی (ماں) اس دُنیا سے رخصت ہو چکی ہے (آمین)۔ اس ماہ کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ اس میں کہانی بڑھیا کا شوربا بہت زبردست تھی۔ باقی بھی کچھ کم نہ تھیں۔ اگلی دفعہ آپ سے پھر ملیں گے۔ اللہ میرے پیارے رسالے کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔ آمین ثم آمین۔ اللہ حافظ! (وردہ زہرہ، جھنگ صدر)

☆ آپ کو سال گرہ مبارک ہو اور بہت سی دعائیں۔

اُمید ہے کہ آپ اور تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیریت سے ہو گی۔ میں کافی دنوں بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں کیوں کہ میرے دسویں جماعت کے امتحان ہو رہے تھے۔ امید ہے کہ آپ کو میری کمی ضرور محسوس ہوئی ہو گی۔ ایک اچھی خبر سنانا چاہتی ہوں، مجھے اس بار ''بہترین طالب علم'' کی سند اور انعام ملا ہے۔ پچھلی بار میرا ''کھوج لگایئے'' میں انعام بھی نکلا تھا۔ اپریل کا رسالہ بہت اچھا لگا اور کہانی ''بڑھیا کا شوربا'' بہت اچھی تھی۔ مئی میں میرے بھانجے انس کی سالگرہ ہے اور میری ایک دوست کی بھی سالگرہ ہے۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ میرے رسالے کو اور ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

☆ آپ سب کو سال گرہ مبارک ہو اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں عطا کرے۔ آمین!

میں تقریباً 2012 سے ''تعلیم و تربیت'' کی قاری ہوں لیکن خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ پلیز! میری حوصلہ افزائی کریں۔ اس شمارے کی سب سے اچھی تحریر ''بڑھیا کا شوربہ'' تھی۔ باقی سب تحریریں بھی بہت شان دار تھیں۔ خاص طور پر دل کش پاکستان، بادلوں کا قلعہ، 66 دن کا راز، پُراسرار مچھلی، عقل مند کسان بھی اچھی تھیں۔ آپی میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں، اگر میرا خط لکھنے کا طریقہ غلط ہے تو مہربانی فرما کر میری اصلاح کر دیں۔ مجھے مایوس مت کیجیے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ملا ہے......

سب سے عظیم تحفہ، تعلیم و تربیت کا
وہ گھر جہالتوں سے آزاد ہو نہ کیوں کر
جس گھر میں ہے سویرا تعلیم و تربیت کا

(تہنیت آفرین، منڈی بہاؤ الدین)

☆ ڈیئر آفرین! خط بہت پیارا ہے۔ قلمی تعاون جاری رکھیں۔

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بہت مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

کشف جاوید، فیصل آباد۔ سیدہ امامہ تنویر، کراچی۔ عمران خان غوری، بہاول پور۔ شیزہ جاوید، گوجرانوالہ۔ عبدالرافع۔ مناہل نسیم، لبابہ مناہل، عائشہ صدیقہ، ایمن قریشی، اسلام آباد۔ فارین شہزاد، پشاور۔ ابرار الحق مودودی، رجبہ جنگ۔ نمیرہ شاہد، کراچی۔ حفضہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ سعدیہ شفیق، حجرہ شاہ مقیم۔ بنت حوا، نازیہ نزی، نوشہرہ۔ حرا سعید شاہ، جوہر آباد۔ شیروتیہ ثناء، حیدر آباد۔ محمد سیف الرحمٰن، خالد محمد، موچھ۔ آمنہ ارم شہزادی، چونگی۔ عباس صارم، عروج جمشید، عثمان علی بھٹی، محمد شاہد، لاہور۔ طوبیٰ بنت عبدالرؤف، سمیرا بنت یوسف، کراچی۔ محمد عرفان آفریدی، جمرود۔ ملک محمد احسن، حاجرہ ابراہیم ورک، حمزہ احمد، راول پنڈی۔ حفضہ، واہ کینٹ۔ بشریٰ رانا، شیخو پورہ۔ انعم مدثر، ثمرہ احمد، سیال کوٹ۔ محمد فہد بٹ، جہلم۔ عفان الٰہی، شرقپور۔ فتح محمد شارق، مریم نایاب، خوشاب۔ اسامہ خباب علی، تلہ گنگ۔ پروین مقصود ہاشمی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ رُمین زہرہ، عمران غوری، بہاول پور۔ حسن رضا سردار، کاموں کے۔ محمد سفیان شاہین، لودھراں۔ غلام حسین نوناری، شہید چوک۔ شاہ زیب، پشاور۔ وقاص احمد قادری، مہک خالد شیخ، لاہور۔ محمد ارشاد، بہاول پور۔ اظہر عباس، پشاور۔ زوبیہ طارق، اسلام آباد۔ آصفہ ممتاز، جھنگ۔ عبدالمقیت عزیز، فیصل آباد۔ زوہیب احمد، ملتان۔

قندِ مکرر

محمد یونس حسرت

قصہ ایک سفر کا

میں ایک ضروری سرکاری کام کے سلسلے میں لاہور سے پشاور جا رہا تھا۔ اباسین ایکسپریس کے درجہ اوّل کے ڈبے میں میری سیٹ ریزرو تھی۔ ڈبے میں تین سیٹیں اور تھیں اور ان پر چٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ دو سیٹیں کسی تقی شاہ کی تھیں اور ایک پر مسٹر صادق علی کے نام کی چٹ لگی تھی۔ گاڑی کی روانگی میں کچھ دیر تھی اور ابھی تک اس ڈبے میں میرے سوا کوئی نہیں آیا تھا۔

گاڑی کے روانہ ہونے میں کوئی پندرہ منٹ رہتے تھے کہ لمبے قد اور بھاری چہرے والا ایک شخص ڈبے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے ایک قلی ایک ٹھیلے کو دھکیلتا چلا آ رہا تھا، جس پر اس شخص کا سامان رکھا تھا۔ سامان کیا تھا، چھوٹی بڑی مختلف چیزوں کا ڈھیر تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس سامان میں دو بڑے بڑے ٹرنک بھی تھے، ایک بچہ گاڑی تھی اور ایک بوری جس میں شاید آلو یا کوئی اور چیز تھی۔ ٹرنک اتنے بڑے تھے کہ ریلوے کے قانون کے مطابق انہیں بریک میں رکھنا چاہیے تھا مگر وہ لمبا تڑنگ اور بھاری چہرے والا مسافر انہیں اپنے ساتھ ہی رکھوانے لگا تھا۔

میں نے ایک نظر اس مسافر کو دیکھا۔ لباس سے وہ کوئی کاروباری آدمی دکھائی دے رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا کاروبار اسے خاصا منافع دے رہا ہے۔ اس نے اندر آ کر اس نشست کی چٹ دیکھی جس پر صادق علی لکھا ہوا تھا اور پھر قلی کو سامان اندر لانے کا اشارہ کیا۔

’’تو یہ مسٹر صادق علی ہیں!‘‘ میں نے اپنے دل میں کہا۔

قلی نے سامان اندر ڈبے میں رکھنا شروع کیا۔ میں اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب قلی چھوٹا موٹا سامان ڈبے میں رکھ چکا اور ایک بڑے ٹرنک کو ٹھیلے پر سے گھسیٹنے لگا تو میں تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھا اور دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

’’ٹھہرو!‘‘ میں نے قلی سے کہا۔ میری آواز سن کر وہ یوں اُچھلا جیسے اسے سانپ نے کاٹ کھایا ہو۔

’’یہ ٹرنک بریک میں لے جاؤ!‘‘ میں نے کہا۔ قلی نے بے بسی سے اپنے مسافر کی طرف دیکھا جیسے اس سے امداد طلب کر رہا ہو۔

"یہ میرا سامان ہے۔" صادق علی نے اکڑ کر کہا۔ "اور میں اسے اپنے ڈبے میں رکھوانا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اگر یہ ٹرنک سیٹ کے نیچے یا اوپر آ جائیں تو رکھ لیجیے ورنہ انہیں بریک میں رکھوایئے۔"

صادق علی نے کہا۔ "آپ کون ہیں؟ ٹکٹ چیکر ہیں کیا؟"

مجھے یہ سن کر غصہ آ گیا۔ اس دو ٹکے کے آدمی نے اتنے بڑے سرکاری افسر کو ٹکٹ چیکر بنا ڈالا! میں دروازے میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ ایسی حالت میں کوئی بھی ڈبے کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ قلی اور نہ سامان۔ میرے اور مسٹر صادق علی کے درمیان تکرار ہونے لگی۔ کچھ لوگ تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ ایک ٹکٹ چیکر بھی آ نکلا اور پھر گارڈ بھی آ پہنچا۔ اسے ساری بات معلوم ہوئی تو وہ کہنے لگا:

"دیکھیے جناب، یہ ان صاحب کا اپنا سامان ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

میں نے بڑے ٹرنکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں بریک میں رکھوایئے۔"

مسٹر صادق علی نے کہا۔ "میں انہیں اسی ڈبے میں رکھوں گا۔"

میں نے سینہ تان کر کہا۔ "میری لاش پر سے گزر کر ہی آپ ایسا کر سکتے ہیں۔"

جب جھگڑا بڑھا تو گارڈ نے یہ تجویز پیش کی کہ قلی ان ٹرنکوں کو سیٹوں کے نیچے رکھنے کی کوشش کرے اور اگر وہ ان کے نیچے نہ آ سکیں تو پھر انہیں بریک میں رکھوا دیا جائے لیکن ٹرنک اتنے اونچے تھے کہ ان کا سیٹوں کے نیچے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب میں نے قلی کو وہ ٹرنک بریک میں رکھتے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے سرکاری قاعدے قانون کی پابندی کروا کے ایک بہت بڑا فرض ادا کیا ہے۔ مسٹر صادق علی مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مارے غصے کے ان کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

اب نو بج گئے تھے اور ابھی تک تقی شاہ کا کوئی پتا نہ تھا۔ مسٹر صادق علی نے گارڈ سے کہا۔ "جناب، میں اس ڈبے میں سفر کرنا نہیں چاہتا۔"

گارڈ نے کہا۔ "اب بہت دیر ہو چکی ہے اور اس ڈبے کے علاوہ اور کوئی فسٹ کلاس کا ڈبا اس گاڑی میں نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سیٹی بجا کر سبز جھنڈی دکھائی۔ انجن حرکت میں آیا اور

گاڑی روانہ ہوگئی۔

مسٹر صادق علی میری طرف پیٹھ کیے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ ان ٹرنکوں کے بارے میں فکرمند تھے جنہیں میں نے بریک میں رکھوا دیا تھا۔ ہوسکتا ہے ان ٹرنکوں میں کچھ قیمتی چیزیں ہوں اور مسٹر صادق علی کو یہ فکر ستائے جا رہی ہو کہ کہیں وہ چوری نہ ہو جائیں۔

''کیا آپ اخبار دیکھنا پسند کریں گے؟'' میں نے یہ کہتے ہوئے گویا اپنی طرف سے صلح کی پیش کش کی لیکن میری اس پیش کش کا مسٹر صادق علی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ انہوں نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ ان کی تنی ہوئی گردن ان کے غصے کو صاف ظاہر کر رہی تھی۔

اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑکی کا اوپر کو اُٹھا ہوا شٹر کھٹاک سے مسٹر صادق علی کے سر پر گرا۔ انہوں نے گھبرا کر شٹر کو اوپر کیا اور سر پر ہاتھ پھیرا تو ان کا ہاتھ خون سے بھر گیا۔

''اوہو! آپ تو زخمی ہو گئے ہیں!'' میں نے کہا۔ ''کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟ میرے سامان میں آئیوڈین کی شیشی موجود ہے۔''

انہوں نے تلخی سے کہا۔ ''آپ سے امداد لینے کی بجائے میں مر جانا قبول کرلوں گا۔''

میں ان کے رویّے سے بے حد حیران ہوا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔ خیر، میں نے ان کے اس رویّے کو نظرانداز کر دیا اور اخبار کے مطالعے میں کھو گیا۔

مسٹر صادق علی نے اپنی سیٹ کے نیچے سے کھانے کی ٹوکری نکالی اور کھانا کھانے لگے۔ میں اخبار میں یوں کھویا رہا جیسے میں نے ان کو کھانا کھاتے دیکھا ہی نہیں۔

رات کے گیارہ بجے تو میں نے اپنا بستر بچھایا اور گڈ نائٹ کہہ کر لیٹ گیا۔ مسٹر صادق علی نے کوئی جواب نہ دیا اور کوئی پندرہ منٹ بعد وہ بھی اپنی برتھ پر لیٹ گئے۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا تکیہ اپنے سر کے نیچے رکھا اور اوپر شال اوڑھ لی۔

ساڑھے سات بجے میری آنکھ کھلی تو میں نے مسٹر صادق علی کی طرف دیکھا۔ وہ پیٹھ کے بل لیٹے ہوئے تھے اور ان کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔

میں نے صابون تولیہ لیا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔ باتھ روم سے فارغ ہو کر نکلا تو آٹھ سوا آٹھ ہو رہے تھے اور مسٹر صادق علی اب تک اسی طرح سوئے ہوئے تھے۔ میں نے خاصی اونچی آواز میں کہا۔

''صادق علی صاحب! اُٹھیے! صبح ہوگئی ہے۔''

مگر جواب میں انہوں نے جنبش تک نہیں کی۔ میں نے پھر کہا۔ ''اب اُٹھ جائیے۔ پشاور آیا ہی چاہتا ہے۔''

جب اس پر بھی انہوں نے کوئی حرکت نہ کی تو میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے اپنے شب خوابی کے کپڑے تبدیل کیے اور انہیں ہولڈال میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے اخبار کے وہ صفحات پڑھنے شروع کر دیئے جو اب تک نہیں دیکھ سکا تھا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد ہی گاڑی پشاور کے اسٹیشن پر جا پہنچی۔

میرے دو دوست مجھے لینے آئے تھے۔ میرا نوکر میرا سامان اکٹھا کر کے اسے قلی کے حوالے کر رہا تھا۔ میں اپنے دوستوں سے باتیں کرنے لگا۔

''ارے ہاں، میرے سفر کا ساتھی تو گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے۔ میں نے اسے جگانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ جاگا ہی نہیں۔'' یہ سن کر میرا ایک دوست جو خیر سے مجسٹریٹ تھا، ڈبے کے اندر داخل ہوا اور مسٹر صادق علی کے پاس جا کر پکارا۔ ''اٹھو میاں! پشاور آ گیا ہے۔'' لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس پر مجسٹریٹ نے اس کا بازو ہلایا اور پھر ایک دم یوں پیچھے ہٹ گیا جیسے اسے سانپ نے ڈس لیا ہو!

''او مائی گاڈ! اس کا ہاتھ تو برف کی طرح ٹھنڈا ہے!''

یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر اسے ذرا غور سے دیکھا۔ پھر تقریباً چیخ کر کہا۔ ''میرے خیال میں تو یہ مر چکا ہے۔''

''ناممکن! بالکل ناممکن!'' میں نے کہا۔ ''میں جب سونے کے لیے لیٹا ہوں تو یہ حضرت بالکل اچھے اور بھلے چنگے تھے۔''

''اوہ! یہ اس کے سر پر خون کیسا ہے؟'' میرے دوست نے حیرانی سے پوچھا۔

خون! کیسا خون؟''

دوست نے کہا۔ ''اس کے سر پر ایک زخم ہے اور زخم کے آس پاس خون جما ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے سوتے میں اس پر حملہ کیا ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کل شام کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا تو اس کا شٹر اس کے سر پر آ گرا تھا۔''

ہم نے گارڈ کو بلایا۔ وہ ریلوے کے ڈاکٹر کو لے کر آیا اور ڈاکٹر نے معائنے کے بعد فیصلہ دیا کہ مسٹر صادق مر چکے ہیں۔

گارڈ نے ریلوے پولیس کے تھانے دار کے کان میں کچھ کہا۔

تھانے دار میری طرف آیا اور بولا۔ ''ایک منٹ جناب۔''

''فرمایئے؟'' میں نے کہا۔ ''شاید آپ کچھ اور جاننا چاہتے ہیں۔''

تھانے دار بولا۔ ''ہاں، جناب! گارڈ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اور اس مسافر کے درمیان لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر جھگڑا ہوا تھا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے صرف ان صاحب کے ٹرنکوں کے ڈبے کے اندر رکھے جانے پر اعتراض کیا تھا۔''

تھانے دار کہنے لگا۔ ''لیکن آپ تو ڈبے کے دروازے میں تن کر کھڑے ہو گئے تھے اور آپ نے زبردستی اسے ایسا کرنے سے روکا تھا۔ گارڈ کا یہی کہنا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے ایسا ضرور کیا تھا، لیکن میرے رویے میں کوئی سختی یا تلخی نہیں تھی۔''

''کہیں اس کے سر کے زخم کے ذمہ دار آپ ہی تو نہیں ہیں؟'' تھانے دار بولا۔ ''آپ ہی نے تو رات کے وقت اس پر حملہ نہیں کیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''اتنی گھٹیا اور گھناؤنی حرکت کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''معاف کیجیے۔'' تھانے دار نے کہا۔ ''ہمیں آپ کو حراست میں لینا پڑے گا۔ سارے واقعات آپ کے خلاف جاتے ہیں۔''

مجھے سچ مچ غصہ آ گیا تھا، مگر اس غصے کے باوجود تھانے دار مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے گیا۔

دوسرے دن مجھے عدالت میں پیش کیا گیا اور جج نے مسٹر صادق علی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھ کر مجھے باعزت رہا کر دیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اگرچہ سر کے زخم کا ذکر موجود تھا مگر یہ بھی بتایا گیا تھا کہ سر کا یہ زخم ایسا نہیں تھا کہ اس سے موت واقع ہو سکتی۔ ڈاکٹر کی رائے میں موت اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے سے واقع ہوئی تھی۔

اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر میں نے ایک بار پھر باتھ روم کا رُخ کیا تاکہ غسل کر کے اس منحوس سفر کے اثرات زائل کر سکوں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مسٹر صادق علی کی موت معائنے سے کوئی تین چار گھنٹے پہلے واقع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اتنا عرصہ بے خبری میں ایک لاش کے پاس لیٹا رہا تھا۔

وہ دن اور آج کا دن، میں نے پھر کسی مسافر کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی، چاہے اس کے ساتھ کتنا ہی سامان کیوں نہ ہو اور اس کے ساتھ ہی میں نے رات کے وقت کبھی ایسے ڈبے میں سفر نہیں کیا جس میں میرے ساتھ صرف ایک مسافر ہو۔

☆☆☆

چیتا روئے زمین کا سب سے تیز رفتار اور نہایت قدیم جانور ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بگ کیٹ میں یہ سب سے پہلے پیدا ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کا ارتقاء 4 بلین برس پہلے ہوا کیوں کہ اس زمانے کے کچھ رکاز کچھ عرصہ پہلے شمالی امریکا میں دریافت ہوئے، لیکن ایک دوسرے خیال کے مطابق شمالی امریکا کا پوما (PUMA) اس کا جد ہے جو تین بلین برس قبل دُنیا کے بیشتر علاقوں میں پھیل گیا تھا۔

دُنیا بھر میں تقریباً 14 ہزار کے قریب چیتے ہیں، جن میں سے دُنیا بھر کے چڑیا گھروں اور ذاتی رہائش گاہوں میں قید چیتوں کی تعداد 1300 ہے جب کہ 12 ہزار سے زائد چیتے مختلف جنگلات میں پائے جاتے ہیں۔ بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق یہ جانور جسے پاکستان کے شمالی علاقوں میں پودم بھی کہا جاتا ہے، افغان جنگ اور پاک بھارت کشیدگی کے باعث متاثرین میں سے ہے۔ اس خوب صورت جانور کا شمار بین الاقوامی سطح پر معدوم ہونے والے جانوروں کی فہرست میں ہوتا ہے۔

چیتے کو مصری تہذیب میں کافی اہمیت حاصل تھی۔ حکومت کی سرکاری مہر پر چیتے کی تصویر بنی ہوتی تھی۔ مصر میں اس کو میفدی (Mafde) کہا جاتا تھا۔ دربار میں اس کی موجودگی کو بادشاہ کی شان اور اس کے تاج کا نگہبان کہا جاتا تھا۔ مصری، چیتے کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اسے روح کی سواری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے کئی شاہی گنبدوں میں چیتے کی تصویر یا مجسمے بنے ہوتے ہیں۔ اکبرنامہ میں چیتوں کا ذکر موجود ہے۔ جہانگیر بادشاہ کے دربار میں چیتے موجود رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس بادشاہ نے چیتوں کی تعداد کے لیے اعداد شماری کروائی اور دن بدن گھٹتی تعداد کے پیشِ نظر تقریباً 900 چیتوں کی افزائش کروائی۔

چیتا لفظ دراصل ہندوستانی لفظ (Chita) سے ماخوذ ہے جس کے معنی دھبے دار ہیں۔ چیتا ایک پستانیہ ہے جو آرٹو ڈیکٹلا (Arttodactyla) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا سائنسی نام ایکنوکس جوبٹس (Aclnoyx Jubutus) ہے۔ اس کو ہنٹنگ لیوپارڈ (Hunting Leopard) بھی کہا جاتا ہے۔

چیتا میدانی علاقوں میں رہتا ہے اور زمینی جان داروں میں سب سے زیادہ تیز رفتار جانور ہے۔ اس کے دوڑنے کی انتہائی رفتار 120 کلومیٹر فی گھنٹا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف دو چار سیکنڈ میں یہ 90 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار حاصل کر لیتا ہے۔

حرکت کے پہلے ہی لمحے میں اس کی رفتار 20 کلو میٹر سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ صرف تین چھلانگوں میں 80 کلو میٹر کی رفتار پکڑ لیتا ہے اور 20 چھلانگوں کے بعد اس کی رفتار اور طریقہ رفتار قابلِ دید ہوتی ہے۔ یہ ہر سیکنڈ میں تین چھلانگیں بھرتا ہے۔ ہر چھلانگ کے اختتام پر صرف ایک ہی پیر زمین پر لگتا ہے اور ہر چھلانگ میں 30 فٹ سے زائد کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ اس طرح چھلانگ شروع ہونے کے بعد وہ اس قدر زمین پر پیر ٹکائے بغیر فاصلہ طے کرتا ہے کہ دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔ اس کا جسم تیز رفتاری کے لیے ایروڈائینا میکل (Aerdynamicall) ڈیزائن کیا جاتا ہے۔ اس کے پیر اس مقصد کے لیے بہت موزوں ہوتے ہیں۔ ان پیروں میں کچھ مخصوص عضلات پائے جاتے ہیں۔

یہ کیٹ فیملی کا واحد جانور ہے جس کے پنجے چھوٹے اور Blunt ہوتے ہیں جس کی وجہ سے دوڑتے وقت اس کے پنجوں کے شگاف میں کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے اور زمین پر گرفت کی مضبوطی واقع ہوتی ہے۔ پنجوں میں گرہ سخت ہوتا ہے جو تیز دوڑنے اور عجلت میں مڑنے کے لیے نہایت مناسب ہوتا ہے۔ چیتا عموماً ایک منٹ میں 60 مرتبہ سانس لیتا ہے لیکن دوڑتے وقت سانس کی رفتار 150 ہو جاتی ہے۔ چیتے کے جسم کے اعضاء اسی لحاظ سے متبادل شکل اختیار کیے رہتے ہیں۔ اس کا دل مضبوط ہوتا ہے۔ جگر بڑے سائز کا، خون کی نالیاں کشادہ اور مضبوط ہوتی ہیں۔ سانس کی نالیاں اور اڈرینل غدود بھی بڑے ہوتے ہیں۔ چوں کہ سانس کی رفتار تیز ہوتی ہے اسی لیے زیادہ آکسیجن خون میں شامل ہو جاتی ہے جو تمام عضلات کو پہنچائی جاتی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی لچک دار ہوتی ہے۔ نتھنے وسیع ہوتے ہیں۔ پھیپھڑوں (Lungs) میں زیادہ پھیلنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ تیز رفتاری کے باعث جسم کا درجہ حرارت 105 فارن ہائیٹ تک پہنچ جاتا ہے جو عام طور پر دوسرے جانوروں کے لیے مہلک ہے لیکن تمام اہتمام کے باوجود چیتا اپنی یہ تیزی صرف 400 میٹر تک برقرار رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد اس کی تھکن بھی قابلِ دید ہوتی ہے کہ اس کا شکار اس سے کم طاقت ور جانور چھین کر لے جاتے ہیں اور یہ چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہتا ہے۔ یہ دوسرے گوشت خور جان داروں کی طرح گلا سڑا گوشت نہیں کھاتا بلکہ تازہ گوشت کھانے کو ترجیح دیتا ہے۔ چیتے کی لمبائی 2 تا 3 میٹر ہوتی ہے جب کہ دُم نصف میٹر سے کچھ زائد ہوتی ہے۔ اس کا وزن 50 تا 60 کلو کے درمیان ہوتا ہے۔ کیٹس (Cats) کی طرح اس کی آنکھیں بھی بہترین صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں فوویا (Fovea) پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ آنکھ سے ایک لکیر نکل کر چہرے کے نچلے حصے تک پہنچتی ہے جس کو ”اشکوں کی راہ“ کہا جاتا ہے۔ یہ نشان چیتے کی اہم خصوصیت ہے۔ چہرے پر بھی دھبے پائے جاتے ہیں اور دُم پر بھی دھبے موجود ہوتے ہیں۔ دم توازن کی برقراری میں مدد دیتی ہے اور اس قدر تیز دوڑنے کے باوجود جسم کو نہایت تیزی سے موڑنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ چیتے میں 30 دانت ہوتے ہیں جو دوسرے کیٹس کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ میاؤں میاؤں کی آواز نہیں نکالتا بلکہ مختلف آوازوں جیسے چوں چوں وغیرہ کے ذریعے اپنی بات کو اپنے بچوں تک پہنچاتا ہے۔ یہ خوشی کا اظہار خرخر کر

کے کرتا ہے جب کہ غصے کا اظہار غرا کر کرتا ہے۔ غصے میں اس کا جسم بھی زبان بن جاتا ہے اور یہ کان کھڑا کر کے دانت باہر نکالتا ہے اور جسمانی زبان کے ذریعے غصے کا اظہار کرتا ہے۔

چیتا فطری طور پر پُرامن جانور ہے، غیر ضروری حملہ نہیں کرتا۔ کبھی کبھی غصے کے دوران غرا کر تھوکتا ہے۔ اس میں سننے اور سونگھنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بغیر پانی کے عرصہ دراز تک زندگی گزار سکتا ہے کیوں کہ شکار کے جسم کا پانی ہی اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔ چیتے عموماً اپنی غذا خود تلاش کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ غول کی شکل میں بھی پائے جاتے ہیں۔ غول میں رہنے والے چیتے عموماً نر ہوتے ہیں اور تمام ایک ہی چیتے کی اولاد بھی۔ یہ اپنے غول میں دوسرے چیتوں کو کم ہی شامل کرتے ہیں۔ اس کا شکار ہرن، خرگوش اور دوسرے چھوٹے جانور ہوتے ہیں۔ یہ عموماً صبح کے وقت شکار کرتے ہیں۔ بوقت شکار تقریباً 7 میٹر کا فاصلہ ایک ہی لمحے میں طے کرتے ہیں۔ یہ شکار کو بھاگنے کا موقع دیے بغیر تیزی سے فاصلہ طے کرتے ہیں۔ شکار پر جھپٹنے کا عمل 20 سیکنڈ میں مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ حملہ کرنے کے فوری بعد اس کی ہوائی نالی بند کر دیتے ہیں تاکہ دم گھٹنے سے شکار کی موت واقع ہو جائے۔ چھوٹے جان داروں جیسے خرگوش وغیرہ کو ان کی کھوپڑی سے پکڑ کر سیکنڈوں میں ختم کر دیتے ہیں۔

چیتے کو بلی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ماہرین کے مطابق جب چیتا شکار کھیلنے کے لیے کسی جانور کے پیچھے بھاگتا ہے تو اس کا بدن سکڑ کر پھیلنے لگتا ہے، حتیٰ کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ پھیپھڑے اور نتھنے بھی پھیل جاتے ہیں اور بالآخر یہ اپنے شکار کو جا پکڑتا ہے جب کہ شیر، چیتے جیسی پھرتی نہیں رکھتا۔ شیر کی طرح دھاڑتا بھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات تو پرندوں کی طرح چہچہانے لگتا ہے یا مختلف آوازیں نکالتا رہتا ہے۔ ان ہی صفات کی وجہ سے چیتے کو ”فنکار درندہ“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شکاری کو بھی فریب دیتا ہے۔ چیتے کی فریب کاریاں ہمیشہ شکاریوں کو چوکنا رکھتی ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں پایا جانے والا برفانی چیتا اپنی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے دُنیا بھر میں مقبول ہے۔

ماہرین کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان سمیت دُنیا بھر میں چیتے کی نسل ختم ہونے کی وجوہات میں ایک وجہ اس کی اپنی فطری بداحتیاطی بھی ہے۔ 95 فی صد چیتوں کے بچے بچپن ہی میں مار دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان شکار کرتے ہیں۔ زیادہ تعداد شیروں اور لگڑ بگڑ کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چیتا اپنے بچوں کو ان درندوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ شیر کی درندگی سے بڑے بڑے جانور بھی پناہ مانگتے ہیں، مگر لگڑ بگڑ کی گوشت خوری سے شیر اور چیتے بھی خوف کھاتے ہیں۔ چیتے کے لیے پاکستان بلاشبہ بہترین پناہ گاہ ثابت ہو رہا ہے مگر ناکافی سہولیات کی وجہ سے چیتے کی نسل پروان نہیں چڑھ رہی۔

ماہرین کے مطابق پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں وادیٔ نیلم میں برفانی چیتے پائے جاتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق پاکستان میں 400 کے قریب برفانی چیتے پائے جاتے ہیں۔ یہ جانور سوات اور کشمیر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چیتے کی کھال بہت زیادہ مہنگی ہوتی ہے۔

ماحول اور جنگلی حیات کے تحفظ کے لیے دُنیا بھر میں کام ہو رہا ہے۔ مختلف تنظیمیں اپنے اپنے انداز میں مختلف شہروں میں مصروف عمل ہیں۔ ان تمام تر کوششوں کے باوجود انسان ہی ماحول اور جنگلی حیات کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ اس کی ایک مثال برفانی چیتے ہیں۔ تازہ تحقیق کے نتائج کے مطابق دُنیا میں برفانی چیتے کی نادر نسل میں تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ 1994ء میں دُنیا بھر میں برفانی چیتوں کی کل تعداد سات ہزار چار سو تھی جو اب چھ ہزار سات سو اسی کے قریب ہے۔ جن 12 ممالک میں چیتے پائے جاتے ہیں ان میں پاکستان واحد ملک ہے جہاں برفانی چیتے کی نسل میں 33 فی صد اضافہ ہوا ہے۔ ہر سال دُنیا میں 210 برفانی چیتے جو کل تعداد کا 2.72 فی صد ہیں، شکاریوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ماہرین کے خیال کے مطابق اگر برفانی چیتے کے سفاکانہ قتل کا سلسلہ جاری رہا تو آئندہ 30 برسوں میں ان کی نادر نسل کا دُنیا سے مکمل خاتمہ ہو جائے گا۔

پاکستان میں برفانی چیتا صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور شمالی علاقوں چترال، دیر، سوات، کوہستان، گلگت بلتستان، ہنزہ، کاغان اور مظفر آباد میں پایا جاتا ہے۔ ملک میں برفانی چیتے کے تحفظ کے لیے آٹھ نیشنل پارک بنائے گئے ہیں۔ ☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 / مئی 2016ء ہے۔
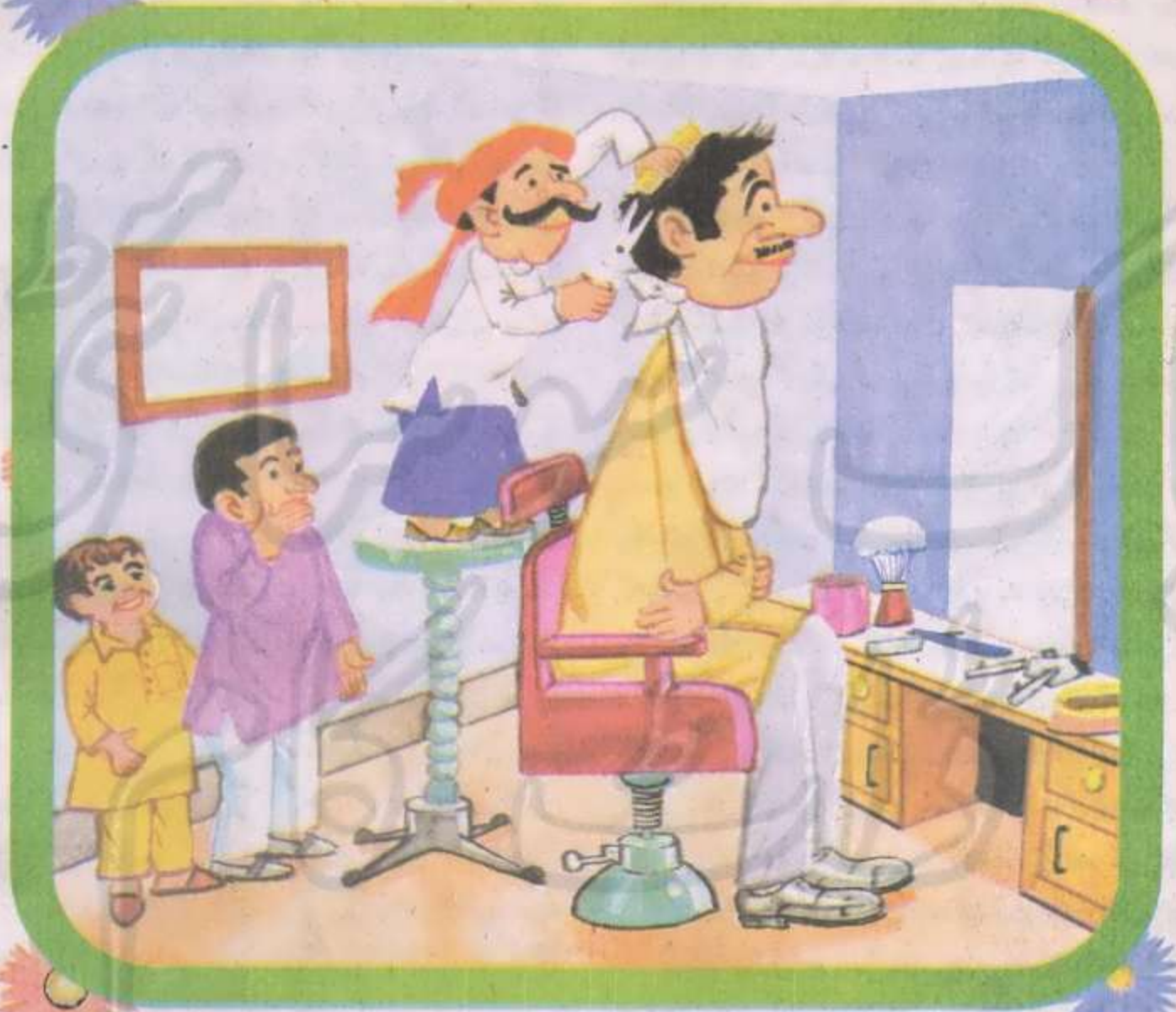
اپریل 2016ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- کیا خوب ہوا ہاتھی اور بندر کا میل، اب ہوگا زبردست کھیل (سیدہ امامہ، کراچی)
- ہاتھی اور بندر کھیل رہے ہیں ڈراف، بندر جیتنے کے لیے ہے بے تاب (ملائکہ امین، کراچی)
- بندر ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے (صارم ندیم، حیدر آباد)
- ساحلِ سمندر کا پیارا ماحول، بندر، ہاتھی کھیلیں بارہ گوٹ (محمد حسنین خاور، اٹک کینٹ)
- بھائی جان میں خالی بندر ہی نہیں، مقدر کا سکندر بھی ہوں (علینہ احمد، راولپنڈی)

ہمارا اسکول

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

شیزہ جاوید، گوجرانوالہ (پہلا انعام :195روپے کی کتب)

محمد زبیر جمشید، جہانیاں (دوسرا انعام :175روپے کی کتب)

اقراء زینب، چکوال (تیسرا انعام :125روپے کی کتب)

خنساء امتیاز، راول پنڈی (چوتھا انعام :115 روپے کی کتب)

بینش طارق، ملتان (پانچواں انعام :95روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: حیدر علی حجازی، مومنہ عامر حجازی، لاہور۔ میمونہ ضیاء، حافظ آباد۔ ثمامہ عظمت، راول پنڈی۔ سعیدہ تحریم مختار، لاہور۔ سعد حبیب، مانسہرہ۔ مومنہ مقصود، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد نعمان شریف، اوکاڑہ۔ خنساء کاشف، کراچی۔ فاطمہ انظہار، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ احمد بن وقاص، اوصید بن وقاص، سحرش طارق، ملتان۔ شعیب نذیر، احمد پور لمہ۔ ثناء اللہ صادق، ایبٹ آباد۔ طہٰ حسین، کراچی۔ ورشین، شیخوپورہ۔ پروین مقصود ہاشمی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عائشہ شہزاد، ایبٹ آباد۔ زینب گل، اسلام آباد۔ ویلجا فاطمہ، تلہ گنگ۔ جویریہ یونس، لاہور۔ حرم الطاف، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ فرتاش نعمان، راول پنڈی۔ مسفرہ ظفر، راول پنڈی۔ محمد شمعون بٹ، لاہور۔ سارہ مقصود، چکوال۔ عبدالرحمٰن رضا، رحیم یار خان۔ ساریہ نعمان، لاہور۔ صابر خان، محمد سلمان خان، صادق خان، سیلانی عبدالستار، القیس احمد، صباء بابر، امہ لیلیٰ، سعد خان، ملتان۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

جون کا موضوع
آموں کا باغ
آخری تاریخ 8 جون

مئی کا موضوع
گرمی آئی گرمی
آخری تاریخ 8 مئی